شگفتانے

(فکاہیہ تحریریں)

ڈاکٹر شفیق سوپوری

شگفتانے

(فکاہیہ تحریریں)

شگفتانے

(فکاہیہ تحریریں)

ڈاکٹر شفیق سوپوری

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

SHUGUFTANE (Humour and Satire)

by: **Dr. Shafaq Sopori**
1/101, Highland Enclave, Gogo Humhama
Near Srinagar International Airport Budgam 190021
Contact No: 9419001693, 9622452326
E-mail: drshafaqsopori333@gmail.com

Year of 1st Edition 2017
ISBN 978-93-86486-22-6
Price Rs. 150/-

نام کتاب	:	شگفتانے
مصنف	:	ڈاکٹر شفق سوپوری
سالِ اشاعت	:	۲۰۱۷ء
تعداد	:	۵۰۰ (پانچ سو)
قیمت	:	۱۵۰ روپے
سرورق	:	عبدالغنی
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	TFC سنٹر گاؤکدل سرینگر#2473818
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے:

☆ شب خون کتاب گھر، پوسٹ بکس 13، الہ آباد 211003 (یوپی)
☆ میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر
☆ کتاب گھر، مولانا آزاد روڈ، سرینگر، کشمیر ☆ گلشن بکس، ریذیڈنسی روڈ، سرینگر، کشمیر

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

دانشورانہ ظرافت کے پیکر

استاذی المکرم

پروفیسر قاضی غلام محمد

کے نام

مصنف کی دیگر تصانیف

دل خاک بسر	(غزلیات)
بیتے موسموں کے دکھ	(گیت اور نظمیں)
دشت میں دور کہیں	(غزلیات)
اُردو غزل اور ہندوستانی موسیقی	(تنقید و تحقیق)
موسیقی، شاعری اور لسانیات	(ایضاً)
جہات	(ایضاً)
مخزنِ موسیقی	(تحقیق)
غ۔م۔طاؤس (فن اور شخصیت)	(تنقید و تحقیق)
کلامِ فیضؔ کا عروضی مطالعہ	(تحقیق)
نیلیما	(ناول)

طیش لفظ

ع اے نالہ! واہ، خوب ہی تو نے اثر کیا

ایسا مغلوب الغضب آدمی ہم نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔ مزاج تنا ہوا تار کہ ذراسی ہوا لگی اور جھنجھنا اٹھا۔ جھنجھناہٹ کے صدمے سے کبھی کبھی پردۂ ساز بھی لرزنے لگتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اک ذراسی بات پر آپے سے باہر ہو گئے۔ شوروغوغا سے ایسی بھاگڑ پڑگئی کہ یہ پتہ لگانا مشکل ہوا کہ آخر کس بات پر مشتعل ہو گئے۔ اس عرصۂ محشر میں اگر اپنی بدبختی سے کوئی غصے کی وجہ پوچھ بیٹھتا تو بجلی اُسی کے سر پر گرتی۔ ایسے حالات میں افرادِ خانہ پہلے اپنے اپنے گریباں میں منہ ڈال کے جھانکتے پھر ایک دوسرے کا گریباں پھاڑ کر شناختی پریڈ سے معتوب کی نشاندہی کرنے کی کوشش کرتے۔ غصہ دراصل ان کی نفسیاتی مجبوری تھی، اُن کو غصے کی لت تھی اور طلب مٹانے کے لیے وہ کوئی نہ کوئی وجہ ڈھونڈ ہی لیتے تھے۔

والد کی موجودگی میں جملہ افرادِ خانہ کے روزانہ امور پر سخت پابندیاں عائد ہو جاتی تھیں۔ مثلاً ہمیں ان کی آواز کے دائرے میں اصالتاً حاضر رہنا پڑتا تھا۔ ہم ان کے پہلو میں بھی ہوتے تب بھی اُسی کرخت لہجے میں للکار کر

پکارتے۔ کبھی کسی کام سے بھیجتے تو مٹی کی دیوار پر پانی کا چھینٹا مار کر فرماتے:
''پانی کے دیوار پر سوکھنے سے پہلے لوٹنے کی شرط ہے''۔ بزرگوار گھر میں ہوتے تو ہمیں آہ و بکا، نغمہ سنجی یا رونے بسورنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ آہ و بکا کو وہ نحوست کی علامت مانتے تھے چنانچہ جس پر لاٹھی برساتے اگر وہ ضبطِ گریہ کرتا تو غضب سے جلد ہی چھوٹ جاتا ورنہ بقول میر دردؔ

تیرے سبب سے اور بھی مجھ پر غضب ہوا
اے نالہ واہ! خوب ہی تو نے اثر کیا

موسیقی سے ان کو نفرت تھی۔ فرماتے تھے ''جس گھر میں آلات موسیقی آگئے وہاں سے رزق اُٹھ گیا''۔ بزرگوار کے عقیدے کو اگر صحیح مانیں تو اب تک آدھی دنیا بھوک سے مر گئی ہوتی۔ فجر کی نماز کے بعد اوراد شریف مترنم پڑھتے تھے۔ ان کے ترنم کا دارومدار آریاؤں کی طرح صرف دوسُروں پر تھا، دونوں سُر تیور۔ جس نغمے میں خدا، رسولِ خداؐ اور بزرگانِ دین کی مدح یا دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہوتا، اُسے سن کر ان پر وجد طاری ہوتا تھا۔ ایک دن ہم نے سرخوشی کے عالم میں سیٹی بجائی کہ بزرگوار نے رنگے ہونٹوں دھر لیا۔ مار پیٹ کے بعد فرمایا کہ سیٹی بجانا چرواہوں اور بدکرداروں کا وطیرہ ہے۔

اُن کی غیر موجودگی میں گھر کے اندر سکھ شانتی کی ساون ہوائیں چلتی تھیں۔ جس دن وہ کسی گاؤں کے لیے نکلتے تھے اُس دن شام تک ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ گئے تو ہیں مگر اپنا رعب داب گھر میں ہی چھوڑ دیا ہے، اپنی آنکھیں وہیں کسی کونے میں ہماری نگرانی کے لیے رکھی ہیں۔ پوری طرح سے احساس

ہوتا تھا کہ واقعی چلے گئے ہیں تو پہلے چہروں پر مسکراہٹ پھیلتی، پھر کھنکھاتی ہنسی سنائی دیتی اور رات گئے قہقہے گونجنے لگتے۔ اس سکھ منڈلی کے ہیرو ہم ہوتے تھے۔ یہیں سے ہمیں مزاح کی لت لگ گئی۔ قدرت نے ہمیں ممیکری کے فن سے نوازا تھا جس کے لیے قصہ بیان کرنے کا ہنر سیکھنا تھا، سو ہم نے اس میں حسبِ استطاعت مشاقی بہم پہنچائی۔ لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ٹوٹتا تھا۔ والد گاؤں سے لوٹتے تو دو چار مریدوں کی صورت میں پیش خیمہ بھیج دیتے کہ ہوشیار! خبردار! ہمارے پہنچنے سے پہلے راہ راست پر آجاؤ اور واقعی ہم لوگ اپنے اعمال و افعال اور کارکردگی کا بغور جائزہ لیتے کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی ایسی واشگاف خطا تو سرزد نہیں ہوئی جس کا انہیں علم ہو سکے۔ اس سلسلے میں نزدیک کے رشتہ داروں اور ہمسایوں سے کنڈک اور کیریکٹر کی سند بھی لے کر رکھتے تھے۔

نثر کے میدان میں ابھی ہم خود کو طفلِ مکتب ہی تصور کر رہے ہیں۔ ہم جب بھی کسی شعری یا نثری تخلیق پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو شعر میں کئی لفظ اور نثر میں کئی جملے چیخ کر پکارتے ہیں کہ ہمیں کس قصور میں سولی پر لٹکا دیا ہے۔ ہم لفظوں سے بہت ڈرتے ہیں کیونکہ سلطنتِ ادب میں لفظ کو وزیر کی حیثیت حاصل ہے۔ وزیر خوش تو بادشاہ اور بادشاہیت سلامت ورنہ ادھر تختہ اُلٹا اور ادھر تختۂ دار پر لٹکا۔

نثر میں اب تک ہماری کئی تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں اور خدا کے فضل سے انہیں ہمارے کرم فرماؤں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ لیکن

شاید ہم جانتے ہیں کہ ان کرم فرماؤں کی اس عنایت کی وجہ ان کتابوں کا موضوع اور مواد ہے نہ کہ ہمارا اسلوبِ بیان، اور زیرِ نظر کتاب قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے ہمیں اس لیے خوف اور تردّد محسوس ہو رہا ہے کیونکہ طنز و ظرافت یا فکاہیہ تحریروں کا بلاواسطہ تعلق مواد سے نہیں طرزِ بیان سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم ساری ذمہ داریوں کو اپنے کرم فرما جناب ظفر اقبال منہاس کے سر چھوڑ کے خود کو بری کر دیتے ہیں کہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں ہی ہم نے ایسا کرنے کی جرأت کی۔

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز میں ہمارا قیام لگ بھگ تین سال کے عرصے پر محیط رہا۔ خدا نے ہمیں کلچرل اکیڈیمی میں تین گرانقدر نعمتوں سے نوازا۔ رفیق مسعودی کی رفاقت، ظفر اقبال منہاس کی محبت اور کچھ عناصر کی رقابت۔ رفیق مسعودی کی رفاقت نے ہمیں ظفر اقبال کے دامنِ محبت میں پناہ لینے پر مجبور کیا اور ظفر اقبال کی محبتوں نے رقیبوں کے ساتھ رشتۂ الفت استوار کرنے کا حوصلہ بخشا۔ ظفر اقبال کے فرزند ارجمند وسیم اقبال نے جب ہفتہ روزہ ''پکار'' نکالنے کے منصوبے کو حتمی شکل دی تو ہم سے ایک کالم ہفتہ وار لکھنے کا وعدہ لیا گیا۔ ہم نے مروت کے جذبے سے مغلوب ہو کر وعدہ تو کیا مگر ایک شرط یہ رکھی کہ اگر گھریلو یا دفتری مصروفیات نے اجازت نہیں دی تو ہم کالم لکھنا بند کریں گے۔ ہوا بھی وہی، اکیڈیمی سے فارغ ہونے کے بعد ہم دفتری اور گھریلو امور میں اس قدر اُلجھ گئے کہ ناچار کالم لکھنا بند کرنا پڑا۔ یہ کالم ہم نے کسی منصوبے کے تحت نہیں لکھے۔ بلکہ ہر ہفتے ہمیں دو

دن پہلے یاددہانی کے طور پر فون کیا جاتا تھا۔ چنانچہ عجلت میں جو بھی ہم سے بن پڑتا تھا ہم لکھ دیتے۔ اس دوران میں ہمارے کچھ کرم فرماؤں نے خاص توجہ دی جس کے لیے ان کا شکریہ ادا کرنا لازمی ہے۔

''اُردو کی بالکل نئی کتاب'' کے بارے میں عرض کروں گا کہ یہ پانچ کالم روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوئے ہیں انہیں ہم نے ایک منصوبے کے تحت لکھا ہے۔ انہیں چھاپنے کے سلسلے میں برادرِ مکرم جاوید آذر صاحب نے جس دلچسپی کا مظاہرہ کیا اس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔ افسوس یہ سلسلہ بھی منقطع ہوا۔ ہم ان سینکڑوں کرم فرماؤں کے بھی شکر گذار ہیں جنہوں نے فون پر یا ای میل کے ذریعہ حوصلہ افزائی کی۔

آخر پر ایک اور شکریہ!

نثر میں غالباً ہماری پہلی تحریر وہ خط تھا جو ہم نے ایک عزیز دوست کے کہنے پر ان کی محبوبہ کو لکھا تھا۔ پھر یہ سلسلہ چل پڑا اور ہم نے ایک مدت تک اپنے دوستوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہم پر دوسروں کے احساسات اور جذبات کی کیفیت منکشف ہوگئی جو اگرچہ کاروبارِ شوق میں ہمارے کسی کام نہ آئی مگر تجربات اور مشاہدات میں وسعت پیدا ہوگئی۔ اس کے لیے ہم اپنے دوستوں اور ان کی سابقہ محبوباؤں کے شکر گذار ہیں۔

ڈاکٹر شفق سوپوری

عبدالسّلام چوبؔی

دروغ برگردنِ روای کہتے ہیں عبدالسّلام چوبؔی آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے کہ ایک دن کسی بد معاشی پر سکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی سیف الدین نے سرزنش کا آغاز تھپڑ سے کیا۔ مشاہدین کا کہنا ہے کہ چوبؔی نے اُسی رفتار سے اُسی سائیز کا تھپڑ ہیڈ ماسٹر کے چہرے پر رسید کیا۔ بقول شخصے گویا مولوی صاحب کے منہ پر اُن کے ناگہانی طمانچے کی زیر اکس کاپی چسپاں کر دی۔ قصبے میں اس واقعے کا بہت چرچا ہوا۔ مولوی سیف الدین نے حال ہی میں دوسری شادی کی تھی جس سے سکول کے چپراسی کو اس کے زعم میں حق تلفی ہوئی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ بڈھئو نے اپنی ہم عمر سے بے وفائی کر کے میری ہمسایۂ ہم سن (بلکہ ہم سینہ) لڑکی سے شادی کر کے اپنی عاقبت بگاڑ دی ہے۔ اسی کم بخت نے مولوی کی پہلی بیوی کو یہ مژدہ سنایا۔ اس نیک بی بی نے کہنا شروع کر دیا کہ سب میری بددعاؤں کا اثر ہے۔ دیکھ لینا ایک دن محکمہ تعلیم طمانچہ مار کر سکول سے اور نئی بیوی لات مار کر گھر سے نکال دے گی۔ اس پر اس کی سوتن کو غصہ آ گیا اس نے خاوند کو دھمکی دی کہ اگر لڑکے کے ساتھ ذرا بھر رعایت برتی تو میں زہر کھا کر کھیت رہوں گی۔ چنانچہ علی الصبح ہیڈ ماسٹر نے کلرک کو بلوا کر سلام چوبؔی کی ڈسچارج سرٹیفکیٹ تیار کروائی اور سلوک ___ برتاؤ، کیریکٹر وغیرہ

کے آگے سرخ روشنائی سے مشکوک لکھ دیا۔ شام کو جب نئی بیوی نے اس باب میں استفسار کیا تو کہا کہ جانِ من! تم خاطر جمع رکھو۔ اس بدکردار کے سینے میں جو کیل میں نے ٹھونک دی وہ اس کی سات پشتوں کے آر پار ہوگئی ہے۔

چوبی کے والد نے واقعہ کو محکمہ تعلیم کے اعلیٰ حکام کی نوٹس میں لانے کی دھمکی دی۔ مولوی سیف الدین کو جب خبر ہوئی تو انہوں نے بلوا کر کہہ دیا کہ تمہارے نالائق بیٹے نے ایک استاد اور مفتی پر ہاتھ اُٹھایا ہے۔ استاد کی حیثیت سے میں نے اسے سزا دی ہے اگر تم نے میرے خلاف اپنی سرگرمیاں بند نہیں کیں تو میں بطور مفتی اس ناہنجار کے خلاف ارتداد کا فتویٰ جاری کردوں گا۔ پھر ساری عمر شہادت کی انگلی ٹوپی میں گھسا کر اپنی بنجر کھوپڑی کو کھجاتے رہنا۔ چوبی کے والد کو جب ارتداد کے معنی معلوم ہوئے تو چپکے رہنے میں ہی عافیت محسوس کی۔ بیٹے کو بہت برا بھلا کہا' البتہ ہاتھ اس تردّد سے نہیں اٹھایا کہ جس مشٹنڈے نے ہیڈ ماسٹر کا خیال نہیں کیا وہ مجھ غریب کا کیا لحاظ کرے گا۔ اس واقعے کے کچھ دن بعد بیٹے کو لکڑی کے ایک کارخانے پر بٹھا دیا۔ جہاں اس نے کچھ ہی عرصہ میں سیب کے کھوکے بنانے میں مہارت حاصل کی۔ دل پر تو چوٹ لگ چکی تھی ادھر کیلوں کی ٹھونک ٹھانک اور آکاش وانی کے فلمی نغموں نے طبیعت میں لے' موزونیت' روانی اور فتنہ پیدا کر دیا۔ چند ہی دنوں میں شعر موزوں کرنے لگے۔

تخلص کا مسئلہ درپیش آیا تو ایک کہنہ مشق شاعر نے کہہ دیا کہ لکڑی تمہارے لئے سبب روزی ہے۔ لکڑی کو فارسی میں چوب کہتے ہیں۔ یائے

نسبتی لگا کر چوبی ہو جاتا ہے۔ آج سے تمہارا تخلص سلام چوبی مقرر ہوا۔ اس طرح سے وہ عبدالسلام ڈار سے سلام چوبی ہو گئے۔ کسی دوست نے کہہ دیا کہ لکڑی کے ساتھ اگر لڑکی کا اہتمام بھی کرو تو شعروں میں سوز و گداز پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ کچھ وقت کے لئے ادھر اُدھر سرگرداں پھرتے رہے۔ گل رخوں کے انتخاب نے جب رسوا کیا تو نظر کارخانے کے مالک کی بیٹی پر ٹک گئی ۔دل میں کہا کہ لو بچہ اور بچے کی ماں بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔ اس عفیفہ نے بھی اپنی طرف سے کمک پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، تاوقتیکہ معاملہ بزرگوں کی نوٹس میں آیا۔ بالآخر دونوں عقدہ نکاح میں بندھ گئے۔

ایک برس گذر گیا کہ معدے میں چونی کے برابر السر ہوا۔ کسی شاعر دوست نے کہہ دیا کہ کثرتِ مے نوشی زخم معدہ پر منتج ہوگئی۔ اس پر ایک ہم مشرب بول اٹھا کہ شراب بذاتِ خود رفعِ تیزاب ہے۔ غالب گمان ہے کہ چوبی نے بوقت مے کشی جو مرغن ضیافتیں از قسم کباب، مچھلی، تکے وغیرہ نوشِ جان کی ہیں وہی ضعفِ معدہ کی موجب بن گئیں۔ انشاءاللہ شربت سے ضرور افاقہ ہوگا۔ خدا عمر دراز کرے چوبی شمعِ محفل سخن ہونے کے علاوہ جان میکدہ بھی ہیں اور رونقِ کوئے جاناں بھی۔

☆☆☆

غلام الدّین خیالؔ

کہتے ہیں غلام الدّین نے جوانی دیوانی کا آغاز بالترتیب عاشقی اور شاعری سے کیا۔ خیالؔ تخلص کرتے تھے لیکن جب تصویر کے پردے میں قیس کے بجائے لیلیٰ عریاں نظر آنے لگی تو دونوں اشغال سے اسی ترتیب سے تائب ہو گئے۔ البتہ تخلص کو ایام شباب کی یادگار کے طور پر سینے سے لگا کے رکھا۔ کافی تگ ودو کے بعد سرکاری ملازمت بہم ہوئی۔ جموں کے جس علاقے میں پہلی پوسٹنگ ہوئی وہاں چند ہی دنوں میں اپنی تنک مزاجی سے مشہور ہو گئے۔ دفتر کا سارا عملہ ان کے غصے سے زیادہ ان کی ایمانداری سے ہراساں تھا۔ طبیعت خشک تھی مگر ساون کے بادلوں کی طرح ہر وقت گرجتے برستے رہتے تھے۔ عرصے تک اس حقیقت سے بے خبر رہے کہ لوگ انہیں دھرم داس وچارؔ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ جب اس بات کا علم ہوا تو اپنے خاص مخبر اس بات کا سراغ لگانے میں لگا دئے کہ اس فتیلے کو کس نے آگ دکھائی ہے۔ دفتر کا سیکشن آفیسر پنڈت ہری کرشن سنسکرت، عربی، فارسی، ہندی اور اُردو زبانوں کا ماہر تھا۔ جس دن معلوم ہوا کہ خس کے ڈھیر میں اُسی نے چنگاری ڈال دی ہے، اسی دن شام سے پہلے بھرے بازار میں اُسے زدوکوب کیا۔ پنڈت جی کی ناک کا بانسا ٹوٹ گیا۔ معاملہ پولیس تھانے تک پہنچ گیا۔ علاقے کے ہندوؤں نے

مشتعل ہو کر ہاتھوں میں بالے اور ترشول اٹھائے۔ ادھر غیرت مند مسلمانوں نے بھی میانوں سے لاٹھیاں کھینچ لیں۔ بازار میں کشیدگی بڑھ گئی۔ دفعہ 144 نافذ کر دیا گیا۔ بارے معاملہ تب ٹھنڈا ہو گیا جب غلام الدین خیالؔ کو یہ یقین دلایا گیا کہ دھرم داس وچاؔران کے نام کا ہندی ترجمہ ہے۔ علاقے کی جامع مسجد کے پیش امام کو یہ کہہ کر قابو میں کر دیا گیا کہ معاملہ مذہبی نہیں لسانی ہے۔ اس واقعے کے چند روز بعد غلام الدین کا ٹرانسفر ہو گیا لیکن اب مزاج میں زیادہ کجی آ گئی تھی۔ کسی نے کہہ دیا کہ سنا ہے دیارِ غیر میں آپ کی وجہ سے فساد کی نوبت آئی تھی۔ جواب میں بولے کہ فساد نہیں میاں جہاد کہیئے۔

دفتر کی جو بھی فائیل ان کے پاس آتی اس پر ضرور کچھ نہ کچھ لکھ کر بکھیڑا کھڑا کر دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ کسی سائل کی درخواست پر یہ لکھ دیا کہ درخواست کنندہ نے جس عاجزی، انکساری، خاکساری اور فروتنی وغیرہ کا مظاہرہ کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی نیت میں کھوٹ ہے لہٰذا راقم الحروف کی دانست میں سائل کا تقاضا اور مطالبہ دونوں بے جا ہیں۔ پرانے آفیسر کا تبادلہ ہوا تو نئے آفیسر کے ساتھ کسی بھی طرح سے تال میل نہ بیٹھ سکا۔ نو وارد نے اپنے ذاتی معاون سے کہا کہ غلام الدّین خیالؔ کو سمجھاؤ، ٹیبل پر خالی فائیل نہ رکھے، تھالی میں کچھ پروسا بھی کرے۔ میں یہاں تالی بجا کر قوالوں کی سنگت کرنے نہیں آیا ہوں۔ میرے بھی بچے ہیں، گھر بار ہے۔ آخر کار ہوا وہی جس کا اندیشہ تھا۔ ایک روز غلام الدّین خیالؔ نے کوئی فائیل تیار کر کے آفیسر کے ٹیبل پر رکھ دی۔ فائیل گم ہو گئی، سائل نے عرصے تک پہلے فائیل کا تعاقب کیا تھا۔ اب

اس کی تلاش میں دفتر نوردی کرنے لگا۔ غلام الدّین کے کسی حاسد نے کہہ دیا کہ فائیل اُسی نے دبا کے رکھی ہے۔ سائل کافی عرصے سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی غلام الدین پر لفظوں کے فائیر کھول دیئے۔ غصے اور اشتعال میں اس کے منہ سے نکل گیا کہ ایمانداری کی رسی سے بندھے ہوئے سانڈ نہ خود کھاتے ہیں نہ دوسروں کو کھانے دیتے ہیں۔ سرکار پاگل ہے جس نے گدھوں کو ہمارے سر پر بٹھا دیا ہے۔ تیر غلام الدّین کے سینے کو چیرتا ہوا ان کے ایمان، ضمیر اور انا تینوں میں ترازو ہو گیا۔ ایک جست میں ٹیبل کو پار کر کے حملہ آور کے سینے پر سوار ہو گئے۔ زخمی سائل نے ان کے خلاف تحریری شکایت کی اور ثبوت کے طور پر درخواست کے ساتھ اپنی خونم خون قمیص اور دانت کا ایک ٹکڑا بھی نتھی کر دیا۔ غلام الدین کے خلاف وجہ بتاؤ نوٹس جاری ہوا۔ جواب میں لکھ دیا کہ مضروب نے سرکار اور راقم الحروف کو بالترتیب پاگل اور گدھا کہہ کر سرکار کے ایک نمک خوار کی غیرت کو للکارا۔ راقم الحروف نے صرف اپنا دفاع کیا اب مدافعت میں غنیم زخمی ہو گیا تو اس میں خاکسار کا کیا قصور ہے۔ آفیسر نے بلوا کر سمجھا دیا کہ دفتر کے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اب تک آپ نے اپنے دفاع میں متعدد افراد کو مجروح کر دیا ہے۔ یہ دفتر ہے اکھاڑہ نہیں۔ آئندہ محتاط رہیں۔ اسکے بعد غلام الدّین کی کوئی فائیل گم نہیں ہوئی۔

☆☆☆

دیباچہ پر دیباچہ

عنوان دیکھ کر آپ ضرور کنفیوز ہوئے ہونگے۔ ہمارے ایک دوست ڈاکٹر پرکاش چند ہیں۔ یونیورسٹی میں اقتصادیات پڑھاتے ہیں۔ اکثر کہتے ہیں کہ کسی کو کنونس نہ کرنے کی صورت میں اُسے کنفیوز کر دیجئے کیونکہ کنفیوژن سے ہی علم فروغ پاتا ہے۔ جزوی طور پر ہم ان کے مقولے سے اتفاق کرتے ہیں کیونکہ معاصر تنقید کی بنیاد کسی حد تک کنفیوژن پر ہی استوار ہے۔ حالانکہ ہم کوئی باقاعدہ نقاد نہیں ہیں مگر پھر بھی نہ جانے کیوں دوستوں کو کنفیوژن ہو جاتا ہے اور وہ ہم سے اپنی کتابوں پر دیباچے تحریر کرنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ اسی کنفیوژن میں کچھ ماہ قبل محمد صابر میر المتخلص بہ گلفامؔ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان کے ساتھ شعری مجموعے کا مسودہ، اخروٹ کا تھیلا اور میرے ایک پرانے دوست کا سفارشی خط تھا۔ ان میں سے زیادہ مرغوب شئے اخروٹ تھی سو ہمارے نوکر نے پاؤ بھر گریاں پلیٹ میں ڈال کر ہمیں پیش کیں جنہیں ہم نے رغبت سے نوش جان فرمایا یہ بھول کر کہ ہم دردِ گردہ میں مبتلا ہیں اور ڈاکٹر نے ہمیں ڈرائی فروٹ سے منع کیا ہے۔ ابتدا میں وہی ہوا جس کی توقع تھی یعنی گردوں میں گرمی اور اس سے منسلک دوسری پیچیدگیاں۔ بعد میں جب ہم نے مسودے پر نظر ڈالی تو لگا جیسے گردوں کا درد دل میں سمٹ کر آیا

ہے

دل میں پھر گریوں نے اک شور اٹھایا غالبؔ

آپ اس صورتحال کو کلام گلفامؔ کے سوز و گداز پر محمول نہ کریں بلکہ ہمیں یہ لگا کہ جیسے ہمیں گریوں سے تیل نکالنے کی مشقت پر مامور کر دیا گیا ہے اور تیل نکالنے کے عمل کی صورت یہ ٹھہری ہے کہ ہم گریوں کو انگوٹھے پر رکھ کر شہادت کی انگلی سے تب تک مسلتے رہیں جب تک کہ تیل اس قدر کشید نہ ہو کہ ہم مٹی کا چراغ جلا کر اس کی روشنی میں گلفام کی شاعری پر منثور مرثیہ تحریر کریں ۔اس سے بہتر تو یہ ہے کہ ہم اپنے صحن میں ایک اخروٹ بو کر آنے والی نسلوں کو اس قدر خود کفیل بنائیں کہ انہیں ہماری طرح کسی ایسے شاعر کے مجموعے پر دیباچہ لکھنے کی حاجت درپیش نہ آئے۔

ہم اس ہمدم دیرینہ کا ذکر کرنا بھول گئے جن کا سفارشی خط مسودے سے منسلک تھا۔محمد منور خان ان کا نام ہے۔یہ کالج میں ہمارے صرف ہم جماعت تھے۔قوی الجثہ اس قدر کہ شکل وصورت ہیت اور ہیبت سے ان کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ہمیشہ معمر اور بارعب نظر آتے تھے۔کالج تک آتے آتے ذہانت کے ساتھ ساتھ حجامت کی زحمت سے نجات پا چکے تھے۔ہم انہیں امتحان میں نوٹس فراہم کرتے تھے جس کے عوض میں وہ ہمارے ذاتی محافظ کے فرائض انجام دیتے تھے۔اکثر کہتے تھے کہ آپ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی طرح سے سائیکل کے مختلف حصوں کو بہلا پھسلا کر انسانی ڈھانچے کی صورت میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ایک دفعہ ہم گر گئے ہماری پسلیوں میں درد

ہونے لگا۔ ڈاکٹر نے ایکس رے تجویز کیا۔ اس پر محمد منور خان بولے کہ بیمار کی پسلیاں اس قدر نحیف، واضح اور نمایاں ہیں کہ نقص دیکھنے کے لئے صرف چشم بینا کی ضرورت ہے۔

ہم نے کالج سے فارغ ہو کر یونیورسٹی کا رخ کیا۔ وہ پے در پے فیل ہو گئے۔ کچھ برسوں کے بعد معلوم ہوا کہ پولیس میں بھرتی ہو گئے آج کل کسی تھانے کے انچارج ہیں۔

ہمیں محمد منور خان کی سفارش کا بہت لحاظ ہے مگر گلفام کی شاعری پڑھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر ان کی جسمانی حالت بھی ایسی ہی ہے تو دیباچے سے زیادہ انہیں مقوی ادویات کی ضرورت ہے۔ ہم نے طوعاً و کرہاً اپنے نوکر سے مشورہ کیا۔ ہمیں بے تکلف دیکھ کر اس نے کہہ دیا کہ جناب شاعروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو شاعر ہیں، دوسرے وہ جو شاعر نہیں ہیں۔ ہم نے کہا بندۂ خدا یہ کیا غضب کر رہے ہو۔ شاعروں کی یہ دوسری قسم تم نے کہاں سے کھڑی کر دی۔ اس پر بولا کہ جناب شاعروں کی یہ قسم ہر چند کہ نہیں ہے مگر ہے۔ ثبوت یہ کہ ہمارے ثقافتی اداروں کے سالانہ بجٹ کا خطیر حصہ اسی قبیل کے شاعروں کی سرگرمیوں کے لئے مختص رکھا جاتا ہے اور یہ کہ ان کی تعداد اب شاعروں کے مقابلے میں اس قدر بڑھ گئی ہے کہ یہ غلط العوام سے غلط العام ہو گئے ہیں لہٰذا اب انہیں استناد کا درجہ بھی حاصل ہونے لگا ہے۔ ہم نے حیران ہو کر پوچھا یہ فتور تمہارے ذہن میں کہاں سے آیا ہے۔ جواباً بولا آپ کے کتب خانے سے۔ ہم نے پوچھا وہ کیسے؟ کہنے لگا راقم الحروف (وہ ادبی

مباحثوں اور مجادلوں میں خود کے لئے راقم الحروف ہی استعمال کرتا ہے) مدت سے آپ کے کتب خانے کی گرد صاف کرتا آ رہا ہے اتنی الرجی ہونا تو لازمی بات ہے۔ یہ سنکر ہم سناٹے میں آ گئے۔ ہمیں یقین نہیں آیا کہ ایک مڈل پاس دیہاتی ایسی باتیں سوچ سکتا ہے۔

☆☆☆

کلیم اللہ

طبیعت نہایت خاموش اور پر اسرار۔ آپ سو باتیں کیجئے وہ ایک بار نفی یا اثبات میں سر ہلائیں گے یا پھر ٹھوڑی کھجائیں گے۔ کوئی معاملہ جواب طلب ہو تو صرف بڑبڑاتے ہیں۔ بات مکھم سے زیادہ مبہم ہوتی ہے۔ دہرانے کا تو سوال ہی نہیں ؂

عارفے کو کہ کند فہم زبانِ سوسن

ساری دنیا سے بے زار، ہمہ وقت باوضو رہتے ہیں، نماز کے اتنے پابند کہ اگر گھمسان کی میٹنگ میں بھی اذان سنائی دے تو وہیں کے وہیں قمیص کی آستین اور پتلون کے پائنچے چڑھا کر بے نیازی سے ٹیبل چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ہم نے انہیں اخبار اور فائیلوں کے سوا کچھ اور پڑھتے نہیں دیکھا۔ اخبار پڑھتے وقت مراقبے میں چلے جاتے ہیں۔ یہ دنیا کے واحد فرد ہیں جو دنیا بھر کے بارے میں جانتے وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں ؂

ہم کہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی؟

ہمارے دفتر کا جمعدار انیس احمد قادری کسی پیشہ ور جاسوس سے کم نہیں۔ ہر وقت سراغ رسانی میں مشغول رہتا ہے۔ ملازمین کے ذاتی، دفتری اور

گھریلوں معاملات کے متعلق کھود کھود کر معلومات جمع کرتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس کے گھر میں کتنے عرصے سے زچگی چل رہی ہے۔ ہم نے ایک دن کلیم اللہ کے بارے میں صرف اتنا پوچھا تھا کہ کئی دن سے غیر حاضر ہیں، ماجرا کیا ہے؟ تو یہ کم بخت موصوف کا پورا زائچہ کھول کر بیٹھا۔ پہلے تمہید کے طور پر کہنے لگا کہ صاحب آپ اس دفتر میں نو وارد ہیں۔ دفتر ہذا میں کسی نئے آفیسر کا اپنے فرائض منصبی انجام دینا کیلوں کی نوک پر لق و دق صحرا عبور کرنا ہے، وہ بھی برہنہ پا۔ آپ کلیم اللہ کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے ان کے منحوس والد کا اپنی پارٹی سے ٹکٹ پر جھگڑا ہو گیا۔ آزاد امیدوار کے طور پر میدان میں کود پڑے۔ کل تک جو حاشیہ برداری کرتے تھے انہوں نے ایک آن میں منہ موڑ لیا۔ الیکشن کے اخراجات کی فکر دامنگیر ہوئی تو خفیہ طور پر ساری زمین بیچ ڈالی۔ ضمانت ضبط ہو گئی۔ بیٹے کو جب معلوم ہوا کہ باپ کے ہاتھ سے کرسی اور اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی تو اخبار میں خود باپ کی جانب سے عاق کا اشتہار دیکر گھر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا۔ شہر آئے، یہیں پڑھائی کی، شادی کر لی اور بچے پیدا کئے۔ شادی کے دوسرے دن سسرال والوں کو تحریری انتباہ بھیج دیا کہ خبردار آج کے بعد میری غیر موجودگی میں کوئی غیر محرم بشمول چاچازاد، ماموں زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد بھائی وغیرہ اگر میرے گھر آیا تو اسی وقت زوجہ کو طلاق دوں گا کیونکہ رشتوں کی آڑ میں جو معاشقے انجام دئے جاتے ہیں وہ بدمعاشیوں اور بدفعلیوں پر ہی ختم ہوتے ہیں۔ نہ کسی سے لین نہ دین۔ حتیٰ کہ ایک دن رشید الدین احمد، آپ کہاں

جانتے ہونگے؟ خدا مغفرت کرے دفتر کے اکاونٹنٹ تھے۔ تین دنوں میں بالترتیب سبک دوش، رانڈ اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہی مرحوم ایک دن بس میں ان کے ہمسفر تھے۔ کنڈیکٹر کے پاس کلیم اللہ کے سو روپے کے نوٹ کا ٹوٹا نہیں تھا۔ از راہ مروت رشید الدین احمد نے ان کا کرایہ ادا کیا۔ موصوف نے دفتر پہنچ کر مرحوم سے ہی سو روپے کا چینج لے کر ریز گاری ان کی ہتھیلی پر دھر کے حساب بیباق کر دیا۔

خود نہایت دیانتدار اور ایماندار ہیں مگر دفتر میں سب بدعنوانیاں ان کی ذاتی نگرانی میں انجام پاتی ہیں۔ فون اور موبائیل کی آلائشوں سے پاک، گھر کا پتہ کبھی کسی کو نہیں بتایا۔ مگر میں جانتا ہوں۔ شہر کے ایک گمنام علاقے کے ایک ویران محلے کی ایک سنسان گلی میں ٹھکانہ ہے۔ آپ سوچ رہے ہیں میں کسی قبرستان کا پتہ بتا رہا ہوں، اسی لئے مسکرا رہے ہیں۔ کچھ دن پہلے سنا کہ درد کمر میں مبتلا ہیں۔ جناب درد جگر اور درد کمر سے پناہ مانگنی چاہیے کیونکہ اول الذکر زمین میں ملا دیتا ہے اگر مریض شاعر نہ ہو اور ثانی الذکر زمین پر چلنے پھر نے کے قابل نہیں چھوڑتا۔ میں عیادت کے لئے گیا تھا۔ بچوں نے ہڑبونگ مچائی تھی، صحن، کمرے، کچن، غسل خانے، برآمدہ، الماریاں جدھر دیکھو بچے ہی بچے۔ یعنی پورے گھر میں مجموعۂ عیال فرد فرد تھا۔ میں نے مرض کی کیفیت پوچھی تو ڈاکٹروں کا رونا لیکر بیٹھے کہنے لگے شہر کا کوئی ماہر استخواں نہیں چھوڑا۔ سب کے سب مریض کی جیب سے رقم اور ہڈیوں سے گودا نکالنے کے فن میں طاق ہیں۔ کس کس کا احوال بیان کروں۔ ایک ایسا ہے کہ جیسے ٹیبل لیمپ کو

کرسی پر بٹھادیا گیا ہو۔ گردن اکڑی ہوئی ہے ہمیشہ پاس پورٹ سائزفوٹو کے پوز میں رہتا ہے۔ مخاطب کسی سمت میں موجود ہو اس کا منہ سامنے ہی رہتا ہے ۔ پتہ چلنا مشکل ہوتا ہے کہ روئے سخن کس روسیاہ کی طرف ہے اس کے دربان سے معلوم ہوا کہ گردن غرور کی وجہ سے نہیں بلکہ مرض کے سبب اکڑی ہوئی ہے ۔ایک میر تقی میر کی طرح بددماغ، عین درد کی جگہ مکے مار کر درد کی کیفیت پوچھتا ہے :

یک مر وہ استخواں شکستوں سے چور تھا
(میرؔ)

اس کی دوا سے کمر کا درد تو دور ہو گیا مگر جو درد مکوں سے پیدا ہو گیا وہ کمر کے درد سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ دونوں کے ملاحظے اور مشورے کا نچوڑ یہ ہے کہ میں کمر بند باندھ کر تختہء غسل پر لیٹا رہوں۔ بازار میں میری کمر کے سائز کا کمر بند بہم نہ ہو سکا۔ کم سے کم سائز کا کمر بند کس کے باندھنے کے بعد بھی اتنی جگہ بچتی ہے کہ میں اپنا سارا ہاتھ ڈال کر پیٹ کو آسانی سے کھجا سکتا ہوں ۔

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

کسی نے کہہ دیا کہ کچی اینٹ کا ٹکور تیر بہ ہدف ثابت ہوتا ہے۔ پورے محلے میں تلاش کرنے کے بعد کہیں سے بہم نہ ہو سکی۔ غسل خانے کی دیوار سے ایک پکی اینٹ نکالی گئی۔ اب نہ باغوں میں وہ جھولے پڑتے ہیں جن میں

جوانی دیوانی ہچکولے کھاتی تھی نہ گھروں میں وہ چولھے جلتے ہیں جن میں ٹکور کے لئے اینٹ سینکی جاتی تھی۔ ناچار بیگم نے گیس چولہے پر اینٹ کو آتشیں بنا دیا :

جز گیس کوئی نہ آیا بروئے کار

اونی کپڑے کے بجائے میری پرانی قمیص میں باندھ کر لائیں تو ٹکور کے دوران اینٹ قمیص کو سوراخ کر کے سیدھے کمر کو جا لگی جیسے پالتھین کے لفافے سے انگارہ نکلتا ہے۔ کمر بری طرح جھلس گئی۔ چھالے پڑ گئے۔ اب ڈسک بھول گیا ہوں۔ سوختگی کا علاج کروا رہا ہوں۔

تک میرِ کمر سوختہ کی جلد خبر لے

☆☆☆

خواجہ صاحب

خواجہ اینڈ سنز تاجرانِ کُتب کے مالک مرحوم خواجہ نعمت اللہ پورے علاقے میں اپنے رعب داب کی وجہ سے مشہور تھے۔ ہم نے سُنا ہے کہ ان کے اجداد مغلیہ سلطنت میں شاہی نعلین بنانے پر مامور تھے، لیکن جب مغلیہ سلطنت پر بجوگ پڑا اور پاپوش سازی کے بجائے ان کی مرمت اور پیوند کاری کی نوبت آگئی تو ان بزرگوں نے تلاشِ معاش کی خاطر جگہ جگہ کی خاک چھان کر پایانِ کار ملکِ کشمیر کو اپنا مسکن بنایا۔ یہ وہ دور تھا جب شاہانِ کشمیر خود پہننے کے لئے اور اہلِ کشمیر کو کھلانے کے لئے فرنگستان سے جوتے منگواتے تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ خواجہ صاحب کے اسلاف نے چمڑے کی تجارت شروع کی اور ان کے دادا نے اپنے بھائیوں کے اشتراک سے چوک میں ایک دکان لگادی:

"شیخ برادران تاجرانِ چرم"

کہتے ہیں جس کا کام اُسی کو ساجھے۔ بالآخر اس دُودمان نے اپنے آبائی پیشے کی طرف مراجعت کی۔ کچھ ہی عرصہ میں پاپوش سازی کے علاوہ دیگر مصنوعات بنانے میں کار کشتہ ہو گئے۔ ہاتھوں میں پھر وہی سِندان' آر' بیونگا'

زنبور' کالبوت وغیرہ لیکر بیٹھ گئے۔ لیکن ایک چوک ان سے ہوگئی۔ وہ یہ کہ اپنے بیٹے یعنی خواجہ صاحب کے والد کو سکول بھیجا جہاں سے وہ آٹھویں پاس ہوکر آئے۔ انہوں نے اپنے والد کی حیات میں ہی جزوی طور پر کاروبار کو تبدیل کر کے اسے جلد سازی تک موقوف ومحدود کردیا۔ باپ کے آنکھیں موندتے ہی بیٹے نے دکان سے پرانا بورڈ اُتار کر نیا چڑھا دیا:

''خواجہ اینڈ سنز تاجرانِ کُتب''

اس بات پر عرصے تک بحث وتمحیص ہوئی کہ وہ تجارت بدلنا چاہتے تھے کہ اپنی ذات۔ اینڈ سنز تو انہوں نے دکان کی برکت اور حریفوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے لکھوادیا ورنہ اولادِ نرینہ ان کی ایک ہی تھی، خواجہ نعمت اللہ۔

خواجہ صاحب پیدائشی بیمار تھے۔ ہر وقت پیٹ میں گیس، معدے میں تیزاب، دل میں کینہ اور منہ میں گالی رہتی تھی۔ ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتے۔ ایک بار شروع ہونے کے بعد کئی گھنٹوں تک معتوب کی سات پشتوں کو قبروں سے نکال نکال کر ان کی ہڈیوں سے گلی ڈنڈا کھیلتے تھے۔ کبھی دوا اور غصے میں ناغہ نہیں کیا۔ ان کی گالیاں طبع زاد اور دوررس ہوتی تھیں۔ ماہِ صیام میں البتہ فارسی گالیاں زیرِ لب دیتے تھے۔ کسی نے کہہ دیا کہ گالی گلوچ سے روزے مکروہ ہو جاتے ہیں اس پر خواجہ صاحب نے کہا بجا کہتے ہو مگر تب جب دشنام شنیدنی ہو۔ کئی بار سرکاری نوکری آفر ہوئی مگر ریٹائرمنٹ کے خوف سے قبول نہیں کی۔ کہتے تھے کہ ریٹائرمنٹ موت سے پہلے کا وقفہء ماندگی ہے جہاں سے سرکاری ملازم دم لے کر آگے چلتا ہے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اپنے سارے ہم عصروں، ہم عمروں، دوستوں بلکہ کئی عزیزوں کے جنازے کو کندھا دے چکے تھے۔ رفتگاں کا ذکر کرتے وقت ان کے نام کے ساتھ متوفی اور سنِ وفات ضرور لگا دیتے تھے۔ ان کے دو داماد فوت ہو چکے تھے۔ تیسرا اور آخری اس خوف سے مرا جا رہا تھا کہ کہیں بڈھا میرے جنازے کو بھی کاندھا دینے تک زندہ نہ رہے۔ وہ اکثر بیوی سے کہتا تھا کہ مجھے سب معلوم ہے، بڈھے کی نظر مجھ پر ہے۔ ادھیڑ عمر کے لوگوں کو بھی قبروں تک کھدیڑ چکا ہے۔ دو دامادوں کو ٹھکانے لگا کر ہی دم لیا اور دیکھنا میری وفات کے بعد ہی دم توڑ دے گا۔ ایک دن ہم سے کہا میاں دعا کرو کہ ہمیں خواجہ صاحب کے جنازے کو کندھا دینے کی سعادت نصیب ہو جائے۔ ہم تاڑ گئے کہ در پردہ کیا کہنا چاہتے تھے

ہجر اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

خواجہ صاحب کو ہمیشہ پیٹ کا درد پریشان کرتا تھا۔ دراصل ان کے پیٹ میں غذا اور بات پچتی نہیں تھی۔ ایک دن ہم سے بولے کہ قدرت نے ہمیں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس مرض میں مبتلا کر دیا۔ کم خور ہوں لہٰذہ بڑی دیر تک جیوں گا۔ میرے سارے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز و ہم عصر بلکہ ہم بستر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کاش وہ میرے ہم مرض اور ہم درد بھی ہوتے۔

ڈاکٹروں کی رائے سے میں نے کبھی اتفاق نہیں کیا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ میرے سارے دوستوں کو بسیار خوری نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ لعل دین بیگ متوفی 1975ء ہارٹ اٹیک میں چل بسا' بھیم سنگھ متوفی 1980ء کو لیور سروسز ہو گیا۔ گوپی ناتھ متوفی 1982ء کے دماغ کی نس پھٹ گئی۔

ہندو مسلم سکھ اتحاد کی اس آخری یادگار کو ہمارے دوست اور ان کے پوتے خواجہ جلیل احمد چلتی پھرتی لوح کہتے تھے جس پر اہلِ قبور کے نام مع سنینِ وفات درج تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں ذہن میں عجیب خبط پیدا ہو گیا۔ مرزا غالبؔ کی طرح وقفے وقفے سے غشی طاری ہوتی تھی۔ عیادت کے لئے جو بھی آتا اس کے تئیں ملک الموت تصور کر کے اس سے ہم کلام ہوتے تھے۔ اس خوف سے لوگوں نے آنا جانا ترک کر دیا۔ ذرا سی حالت سدھرنے پر کہتے تھے کہ دیکھا کیسے ملک الموت کو چکمہ دیا۔ پایانِ کار وہ گھڑی آ ہی گئی جب آدمی لاکھ نہ چاہتے ہوئے بھی لاچار ہو کر کسی انجان امید کے سہارے پر دنیا اور اہلِ دنیا کو الوداع کہتا ہے۔ تمام عمر پیٹ کے مرض میں مبتلا رہنے والے ہمارے خواجہ صاحب کی موت آخر کار ہارٹ اٹیک سے ہو گئی۔ قبر کے سرہانے لوحِ مزار کھڑی کر دی گئی:

خواجہ نعمت اللہ متوفی یکم اگست ۱۹۹۷ء

آئے تھے ہم مثلِ بُلبل سیرِ گلشن کر چلے
لے لو مالی باغ اپنا ہم تو اپنے گھر چلے

☆☆☆

سیّد صاحب

زمانے کا یہی دستور ہے کہ ہر نو وارد اپنے پیش رو کی کارکردگی میں ہزار عیب نکال کر یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے پہلے آنے والوں نے پورے نظام کو تباہی کے دہانے پر اوندھے منہ لا کر چھوڑ دیا ہے۔ پھر وہ تباہی کے دہانے پر پہنچے ہوئے نظام کے سرہانے بیٹھ کر یہی سوچتا ہے کہ اگر میرا نزول بروقت اور برمحل نہیں ہوتا تو پورا نظام خاک میں مل جاتا۔ وہ اپنی طرف سے نظام کو اپنی جگہ پر لانے کی کوشش کرتا ہے مگر تباہی کے دہانے کو یونہی کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ گھر سے لے کر دفتر تک اور دفتر سے لے کر سرکار تک اسی فلسفے پر عمل کیا جاتا ہے۔ باپ، اس کا بنایا ہوا مکان، اس کی نوکری، چال چلن، دوست دشمن یہاں تک کہ اس کی زوجہ دلِ پسراں میں کھٹکتے ہیں۔ نئی سرکار پرانی سرکار کے منصوبوں اور کارگذاریوں کو ناعاقبت اندیشی سے تعبیر کرتی ہے۔ چنانچہ ہر نئی سرکار کے فوراً بعد گذشتہ سرکار کے مرتب شدہ منصوبوں کو ترجیحی بنیاد پر رد کیا جاتا ہے۔ اس عمل میں جو وقت ضائع ہوتا ہے اس سے کم وقت نئے منصوبے ترتیب دینے اور ان پر عمل آوری کے لئے بچتا ہے۔ دراصل اکثر منصوبے اسی واسطے مرتب کئے جاتے ہیں کہ آنے والی سرکار کو انہیں رد کرنے کا موقع میسر آئے۔

ہمارے دفتر میں جب نئے آفیسر نے جوائن کیا تو سب سے پہلے سابقہ آفیسر کے مصاحبوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس کے بعد چیمبر میں آویزاں چوبی لوح پر پرانے آفیسر کا کھاتہ بند کر کے اپنا کھاتہ کھول دیا۔ پھر چیمبر کی ہیئت بدلنے کا منصوبہ ہاتھوں میں لے لیا۔ چنانچہ دروازے، کھڑکیاں، ٹیبل یہاں تک کہ اپنی نشست بھی بدل دی۔ ہم نے نشست بدلنے کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ بازو والی کھڑکی سے پروا چلتی ہے جو گٹھیا کے مریضوں کے لئے مضرِ صحت ہے۔ اس جرم میں پوری کھڑکی کو تیغا کر دیا گیا اور وہاں ایک محرابی الماری کھڑی کر دی گئی۔ اسکے بعد کھڑکیوں، دروازوں، الماریوں، ٹیبل وغیرہ کو مسمار کر کے ازسرنو محرابی شکل میں تعمیر کروایا گیا۔ پورے کمرے میں ہر طرف محرابیں نظر آنے لگیں بقول سید وقار علی پورا کمرہ عیسائیوں کا قبرستان معلوم ہوتا ہے جہاں جگہ جگہ پر لوحِ مزار کھڑی کر دی گئی ہے۔ تجمل رشید نے البتہ کہا کہ کمرہ نہیں گویا کسی پیر و مرشد کی درگاہ ہے۔ اب ضرورت ہے تو بس ایک سید زادے کی جس کی قربانی سے یہ درگاہ مرجعِ عقیدتمندگاں بن جائے گی۔ ہم نے پوچھا وہ کیسے۔ کہنے لگے ایک دفعہ دور دیس کے ایک گاؤں میں ایک مسافر تھکا ماندہ وارد ہوا۔ اس نے گاؤں کے ایک باشندے سے رات کے واسطے جائے پناہ اور خورد و نوش کا سوال کیا۔ جواب ملا کہ دستور اس طرف کا یہ ہے کہ ہم کسی انجان، اجنبی، اور نامحرم شخص کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے البتہ حالت بتاتی ہے کہ آپ کڑے کوسوں کا سفر طے کر کے آئے ہیں۔ رات کو خانۂ خدا میں بسیرا کیجئے، خورد و نوش کا انتظام ہم کرتے ہیں۔ مرتا کیا نہ

کرتا، چاروناچار مسجد میں جاگزیں ہوا۔ کچھ گھڑیاں انتظار کی کھینچنے کے بعد دیکھا کہ وہی شخص سامان خورد ونوش لئے وارد ہوا اور خوب تواضع کی۔ یہ سب کچھ کر کے پوچھا کہ اگر حضور اپنے بارے میں تھوڑا سا احوال بیان فرماتے کہ کون ہیں، کس دیس سے آئے ہیں، کس طرف کا قصد ہے اور وجہ اس حالت زار کی کیا ہے تو میزبان کی دلجمعی ہو جاتی۔ اس پر مہمان بولا کہ دور دیس سے آیا ہوں۔ کئی دنوں تک دشت و بیاباں میں بھٹکتا رہا۔ عرصے سے آدم زاد کی شکل دیکھنے کو ترس گیا تھا۔ سیدزادہ ہوں لیکن کئی دنوں کے فاقے کڑا کے کے کھینچنے کے بعد جب بھوک کی شدت سے احساس ہوا کہ اب بے اجل مرا چاہتا ہوں تو آپ سے دانہ پانی کا سوال کر بیٹھا۔

میزبان نے یہ سنتے ہی آبدیدہ ہو کر کہا کہ سیدزادہ اور یہ دُردشا، وہیں باہ پکڑ کے اٹھا دیا کہ چلئے تشریف لائیے اور غریب خانے پر کرم کیجئے۔ صبح گاؤں میں نوبت بجی کہ بستی میں سید صاحب تشریف فرما ہیں۔ باشندے اس دیہات کے جوق در جوق زیارت کے لئے حاضر ہوئے اور قسم قسم کے تحائف پیش کئے۔ پھر دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر فرد نے لوازمہ ضیافت ایسے سلیقے سے پیش کیا کہ مہمان محظوظ ہوا۔ کچھ عرصے بعد گاؤں کے سب مرغ مرغیاں، ہنس بطخ، پنکھ پکھیرو دعوتوں کے تصرف میں آ گئے۔ پھر حال یہ ہوا کہ بزخانوں، ڈربوں یہاں تک کہ کابکوں میں خاک اڑنے لگی۔ ہر چند کہ مہمان بہتیرا رخصت کی استدعا کرتا رہا مگر کہتے ہیں آدمی کسی کے گھر جاتا ہے تب اس کی مرضی سے پھر آتا ہے۔

ایک دن گاؤں کی چوپال میں ازدہام ہوا۔ سب زن و مرد پیر و جواں جمع ہوئے۔ سید صاحب نے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر کس خوشی میں یہ سب باشندگان جشن منا رہے ہیں۔ اس پر گاؤں کے ایک بزرگ نے دست بستہ ہو کر عرض کیا کہ ہمارے گاؤں میں کوئی درگاہ نہیں۔ ہمیں منت اور زیارت کے لئے کئی کوسوں کے سفر کی صعوبت اٹھانا پڑتی ہے۔ ہم آپ کو قربان کر کے آپ کے مرقد شریف پر ایک درگاہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس دیہات کے لوگوں نے سید صاحب کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا مگر دوسرے دن آفیسر نے ہمیں اپنے کمرے میں بلا کر چائے اور بسکٹ سے پُر تکلف تواضع کی۔ اس کے بعد آرڈر ہمارے ہاتھ میں تھما کر کہا کہ اس دفتر سے آپ کا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ اور ہاں جہاں آپ جوائن کرنے جا رہے ہیں اس گاؤں میں کوئی درگاہ نہیں ہے۔ آپ سیدزادے ہیں، وہاں آپ کی خوب تواضع ہوگی۔

☆☆☆

عارضیؔ

حالانکہ تمام عمر خود کو پُر شباب کہلانے پر مُصر تھے مگر اصطلاح میں عمر کے جس عرصے کو عنفوانِ شباب کہتے ہیں اسی میں محمد سعید عارضیؔ کی طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوگئی اور شاعری ان کی طبیعت میں حمائل ہوگئی۔ علاقے کے ایک گمنام شاعر اور بدنام انسان ذاکر علی جس پر عارض متخلص ہونے کی بھی تہمت تھی کے حلقہء تلمذّ میں آگئے۔ اُستاد سے گہری ارادت، محبت، عقیدت، نسبت اور اپنی ذاتی جہالت کی وجہ سے عارضیؔ تخلص اختیار کیا۔ خود عارضؔ کی شاعری اور کریکٹر دونوں خراب تھے جس کا بلاواسطہ اثر شاگرد کی شاعری اور کریکٹر پر مرتب ہوا۔ سُنا ہے عارضؔ نے شاگرد کو رموز شاعری سکھانے کی آڑ میں دراصل تریا بید کا لٹریچر پڑھایا اور تسخیر جن وزن کے حربے سکھا کر خود سے بھی بڑا دھنپال بنا دیا۔

پریشان نظری کا لپکا پیدائشی تھا۔ اپنی بیوی اور بدصورت عورتوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہمیشہ اپنے دوستوں سے کہتے تھے کہ پری چہروں کو

دیکھ کر جس مرد کے قوائے نفسیانی میں بیک وقت باصرہ، شامعہ، ذائقہ اور لامسہ کے قویٰ متحرک نہ ہو جائیں اُس کو فوراً تائب ہو کر باقی عمر عبادت میں گذارنی چاہیے۔ خود ان کے باقی قویٰ یعنی حسِ مشترک، متفکرہ، واہمہ اور حافظہ رم کے ڈرموں میں Submerge رہتے تھے۔

عارضیؔ کی شاعری کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں جتنے بھی اشعار بزور بازو لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے سب کے مصرعے دولخت ہیں۔ اس بارے میں ان کے ایک دوست کا کہنا ہے کہ جو اشعار مصرعۂ قدوں کی حسرت میں لکھے جائیں ان کا انجام یہی ہوتا ہے۔ موصوف کا یہ بھی خیال ہے کہ عارضیؔ کی شاعری میں شگفتگی، حلاوت اور گھلاوٹ سے زیادہ ملاوٹ کا عنصر شامل ہے۔

سارے امتحانات قسطوں میں (بائی) پاس کیے۔ جس عمر میں طالبانِ علم کتابوں کو سینے سے لگائے رہتے ہیں انہوں نے حسینوں کو سینے سے لگائے رکھا۔ اگر وہ بہم نہ ہوتیں تو دلِ ستم زدہ تو تھام تھام لیتے۔ پوسٹ گریجویشن کے بعد کندھوں سے لے کر گردن تک وہی خم پیدا ہو گیا جو زنبور سے نکالنے کے بعد کیل میں آ جاتا ہے۔ باور یہ کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ گردن اور شانے کتابوں کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے خمیدہ ہو گئے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ان کے شانے اور گردن زلفِ پریشاں کے سوا کسی اور چیز کے باربردار نہ ہوئے۔

شاعری کا سلسلہ تخلص کی طرح عارضی رہا مگر نوکری نے انہیں تیس برس تک اور انہوں نے نوکری کو اسی مدت تک ذلیل و خوار کیا۔ سبکدوش ہونے

کے بعد جس نوکری کو باعث خواری سمجھتے تھے اسی کے (وظیفہ) خوار ہوئے۔ ہر نئے آفیسر پر نئی تسریح کے ساتھ یلغار کرتے۔ بدلے میں ہر نیا آفیسر نئی تمہید کے ساتھ نیا انتباہ اور سرزنش کرتا۔ پانی کاریلا سنگ بوم پر روش بنا سکتا ہے مگر عارضی کی ذات ایسا کھنگر تھی جس کا ڈائینامائٹ بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چنانچہ انہیں دفتر کیلئے ناسور سمجھ کر فراموش کر دیا گیا' ایک ایسا ناسور جس پر نشتر لگانے سے سارا دفتر بلبلا اٹھتا تھا۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آفیسر نے Urgent Case سونپ کر دوسرے شہر روانہ کیا۔ عرصہ دراز تک جب دیارِ غیر سے دفتر اور گھر کو کوئی خیر وخبر موصول نہ ہوئی تو دونوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ان کی بیگم نے سراسیمہ ہو کر آفیسر پر کیس ٹھونک دیا کہ میرے میاں کو قتل کروانے کی غرض سے کسی خطرناک مہم پر روانہ کر دیا۔ آفیسر نے سمجھایا کہ بی بی! نہ میں کوئی اکبر اعظم ہوں اور نہ وہ نالائق کوئی بیرم خان...... وہ نیک بی بی کسی طرح سے مطمئن نہ ہوئیں تو ناچار آفیسر کو از خود سراغ ڈھونڈنے کے لئے نکلنا پڑا۔ کئی دن کی تفتیش کے بعد ٹھکانہ معلوم ہوا۔ آفیسر کا کہنا ہے کہ جس کمرے میں شبانہ چھاپہ ڈالا گیا وہاں سے بالترتیب حسینائیں' موصوف اور فراق گورکھپوری کے شعری مجموعے برآمد ہوئے۔ کئی دفعہ دوستوں نے عارضی کی بیگم کو ان کی کرتوت سے آگاہ کر دیا وہ شریف زادی یہی کہتی تھیں کہ کوئی چوپائے تو ہیں نہیں کہ منہ پر مسکا لگا کر چھوڑ دوں کہ کسی چیز پر منہ نہ ڈال سکیں۔

رم اور رم خوردہ غزالوں سے بہت رغبت تھی۔ کہتے تھے رم نوشوں کو لقوعہ

نہیں مارتا۔ نئے مکان کا نام ارم رکھا۔ پھاٹک کے ستون میں لوحِ مکان چنوادی۔ کسی ظالم نے الف پر تارکول کی پرت چڑھادی

ایک رنگ پر نہ رہنا' یاں کا عجب نہیں
کیا کیا نہ رنگ لائے تب یہ "مکاں" بنایا

کہتے ہیں عمر کے آخری دنوں میں بصارت گئی۔ مگر بیگم کا رونا یہ کہ جس چیز کو جانا تھا وہ نہ گئی بقول میرؔ

جھانکنا' تاکنا' کبھو نہ گیا

☆☆☆

دلی کی اُمیدواریاں سنہ گئیں

(نیم سوانح حیات)

دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

انٹرویو کے دوسرے ہی روز ہم نے خود کو گھر میں نظر بند کر دیا۔ ہماری نظر بندی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم انٹرویو میں پوچھے گئے سوالات کی تفصیل بتانے سے قاصر تھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہمیں خود بھی یاد نہیں تھا کہ ہم سے کس نے کیا پوچھا تھا؟ سوالوں کے اس گھمسان میں ہماری قابلیت' اہلیت اور صلاحیت سے زیادہ سلیکشن کمیٹی کے ارکان یہ ثابت کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے کہ انتظامیہ نے انہیں سلیکشن کمیٹی میں شامل کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔ ایک ممبر تو انگریزی زبان میں سوال پوچھ رہے تھے۔ ان کی انگریزی سُن کر یوں لگتا تھا جیسے انگریزی میں عربی گالیاں دے رہے ہوں۔ تنگ کمرے میں سگریٹوں کے دھویں نے وہ دُھند پھیلائی تھی کہ مشکل سے ہمیں سلیکشن کمیٹی کے ارکان اور انہیں ہم نظر آئے۔ ایک سردار جی بھی موجود تھے جو سوال پوچھنے کی کوشش میں دودِ چراغ محفل سے صرف کھانس رہے تھے۔ ان کی کھانسی سے جو وقفہ پیدا ہوتا تھا اُسے دوسرے اراکین تال کی خالی سمجھ کر سم پر آ کر فوراً تان اُٹھاتے تھے۔

بہر حال چوتھے روز ہمارے کچھ دوست ہم سے ملنے کے لئے آئے۔ ایک کرم فرما نے پوچھا کہ بھئی اس طرح اپنی رضا و رغبت سے اپنے ہی گھر میں مسلسل قید ہو کر تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو؟ تمہاری حالت تو اس بادشاہ جیسی ہوگئی ہے جس کے قلعے پر

دشمن نے محاصرہ ڈال دیا ہو۔ اس پر دوسرے حبیب نے لقمہ دیا کہ شاہانِ اودھ کے پاس تو انگریزوں کے سامنے ڈالنے کے لئے کچھ سامان طرب ونشاط تھا' اس کے پاس تو غنیم کے سامنے ڈالنے کے لئے خود کے سوا کچھ نہیں۔ ہر چند کہ انہوں نے تکلیفِ سیرِ باغ کی بہت ترغیب دی مگر ہم نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ ہمیں خندہ ہائے بیجا کا دماغ نہیں۔ خُدا اخُدا کر کے ان بلاؤں سے خلاصی ملی۔ ساڑھے چار بجے کا عمل تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے سکول کے چپراسی کو دیکھ کر ہمارا دل ڈوب گیا۔ ان دنوں ہم پر قنوطیت اس حد تک غالب تھی کہ ہمیں یہ گمان گذرا کہ صرف یہ اطلاع دینے کے لئے کہ ہماری امیدواری قبول نہیں کی گئی ہے، انتظامیہ نے چپراسی کو روانہ کیا ہے۔ ہم نے کہا فرمایئے؟ چپراسی دو تین دفعہ نفی میں سر ہلا کر بولا......نہیں آن ڈیوٹی ہمیں کچھ فرمانے کی اجازت نہیں۔ بحکمِ انتظامیہ اطلاع دینے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی تقرری عمل میں لائی گئی ہے۔ مبارک ہو' سوموار کو ٹھیک دس بجے جوائن کرنے کے لئے حاضر ہونے کا حکم ہوا ہے۔ ٹھیک دس بجے' ورنہ سوا دس بجے نمبر دو کو مطلع کیا جائے گا جس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ انٹرویو کے دن سے ہی سکول کے احاطے میں گھوم رہا ہے۔ کل کئی امیدوار آدھمکے تھے۔ سب اپنی اپنی مجبوریوں کا رونا رو رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہہ دیا کہ کھلبلی مت مچاؤ۔ اسامی ایک ہے امیدوار پندرہ۔ نوکری کوئی انار نہیں جس کا رس نکال کر سب کو پولیوڈراپس کی طرح پلا دوں

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ' اے آرزو خرامی
دل جوش گریہ میں' ہے ڈوبی ہوئی اسامی

پنتیس سالہ معلّمی کا نچوڑ

یہ وہ دورِ پُر آشوب تھا جب ہمارے مکان کی مرمّت کرنے والا مستری بھی ہمیں احساسِ کمتری میں ڈال کر ہمارے بزرگوں پر یہ باور کرانے کی کوشش کرتا تھا کہ ہم میں کوئی قابلیت اور صلاحیت فطری موجود نہیں۔ ہمارے چاچا اپنے زمانے کے مشہور و معروف مُعلّم رہ چکے تھے۔ ہم نے سوچا انہیں یہ خوشخبری دے کر اپنی خستگی کی کچھ داد پائیں۔ انہوں نے نارمل ایکسپریشن کے ساتھ فرمایا:

"میاں! اس پر زیادہ پھُد کنے کی ضرورت نہیں ہے، پہلے جوائن کرلو پھر گلے میں ڈھول ڈال کر ساری بستی کو خبر بلکہ خبردار کرو کہ میں ٹیچر ہو گیا ہوں۔ جوائن کرنے سے پہلے اُمیدوار پر سو طرح کی مصیبتیں ہوتی ہیں جو بعد میں انتظامیہ کو منتقل ہوتی ہیں۔ کسی کو خبر ہوئی تو نہ جانے کتنے دشمن سر اٹھائیں گے۔ اپنی والدہ کو تو زنہار آگاہ مت کرنا۔ خوامخواہ دُکھیاری کے چہرے پر رونق دیکھ کر ہمسایہ عورتیں بھانپ لیں گی کہ گھر میں شادمانی کی کوئی بات ہے اور ہاں برخوردار! میری پینتیس سالہ معلمی کے تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ مدرس کے لئے عالم و فاضل ہونا ہی لازمی نہیں۔ تدریس کا عمل رعب داب کے بغیر انجام

نہیں دیا جاسکتا۔ پولیس والے کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ جائے تو لاٹھی چارج کے عمل اور اصطلاح کے غائب ہونے سے پہلے اس کے سر سے ٹوپی اور بدن سے وردی اُتر جائے گی۔ ٹیچر کے منہ میں گالی اور ہاتھ میں چھڑی نہ ہو تو کلاس روم میں بدنظمی پھیل جاتی ہے جو اکثر اوقات بچوں کی بغاوت اور ٹیچر کی ذلالت پر منتج ہوتی ہے۔ طالبِ علم سے کبھی غلطی سرزد ہو تو اُسے پچکار کر سمجھانے کی حماقت نہیں کرنا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے پولیس والا بلوائیوں کی یہ کہہ کر فہمائش کرے کہ آتشزنی، توڑ پھوڑ اور قتل و غارت سے باز آؤ ورنہ فلاں فلاں دفعات کے لپیٹے میں آجاؤ گے اور کل کلاں کو اگر عدالت میں جرم ثابت ہوا تو سزائے موت بھی ہوسکتی ہے۔

برخوردار! میری تمنا تھی کہ تم اسلامیہ میں پڑھاؤ، مگر وہاں کی دھاندلیاں دیکھ کر تمہیں جان بوجھ کر مگر مچھ کے حوالے نہیں کرسکتا۔ اسلامیہ والے مدرس کے ہاتھ میں پانسو روپے تھما کر ہزار روپے کی رسید لیتے ہیں۔ ایسا سلوک تو یتیم خانے والے بھی اپنے کارندوں سے نہیں کرتے۔ البتہ وہاں عربی کا سبجیکٹ لازمی ہے۔ اسٹاف اور طلباء ظہر کی نماز باجماعت ادا کرتے ہیں مگر دریا کے کنارے استنجا کرنے سے بچوں کے اخلاق پر بُرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ پرنسپل مولوی محمد ابراہیم سے کہا تھا کہ کچھ غسل خانے لکڑی کے تعمیر کروائیے۔ وہ بولے کہ سکول کے فنڈ سے تختۂ غسل بنانے کی گنجائش نہیں۔ سُنا ہے کچھ دن پہلے بچے کھیل رہے تھے کہ سکول کا فٹ بال دھماکے سے پھٹ کر پُرزے پُرزے ہوگیا۔ ہر چند کہ بچوں نے لاکھ بتایا اور

خود منتظمین بھی جانتے تھے کہ فٹ بال خستہ ہو چکا تھا اور اس کے جگہ جگہ پر ٹیومر نکل آئے تھے، پھر بھی فی (بے) کس دو دو روپے کا جرمانہ عائد ہوا۔ کچھ مفلس بچوں نے گھر سے درخواست لکھوا کر لائی کہ والد سفید پوش اور کثیر العیال شخص ہے اور بعض ماسٹروں نے زوردار حمایت بھی کی تھی مگر مولوی محمد ابراہیم نے بچوں کی عرضداشت کو لغو اور ماسٹروں کی حمایت کو بغاوت سے تعبیر کر کے صاف کہہ دیا کہ یا تو ان بدمعاشوں سے جرمانہ وصول کرو یا پھر میں بالترتیب سکول کی نوکری اور جامع کی امامت سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ سکول کی نوکری چھوڑنے پر تو سبھی رضامند تھے مگر جامع کی امامت کا سن کر سراسیمہ ہو گئے کیونکہ قضیہ پھر مذہبی رُخ اختیار کر سکتا تھا۔

☆☆☆

مولوی محمّد انور

اسلامیہ والوں کے یہاں ریٹائیرڈ اساتذہ کو تلاش کرنے کے لئے ایک خفیہ سرچ کمیٹی کام کرتی ہے۔ نئے ریٹائیرڈ اساتذہ کے لئے اسامیاں پیدا کرنے کی غرض سے پُرانے ریٹائیرڈ اساتذہ کو جبراً ریٹائیر کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے اسلامیہ میں کام کرنے والا ہر ریٹائیرڈ ٹیچر ایک ہی زندگی میں دو دفعہ ریٹائیرمنٹ کی ہزیمت اُٹھاتا ہے:

''دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں''

دراصل یہ سبکدوشی ایک طرح کی برطرفی ہی ہوتی ہے جس کو انجام دینے کے لئے باضابطہ طور پر چارج شیٹ مرتب کی جاتی ہے' اگر تھوڑا سا انتظار کیا جائے تو اس تکلف کی چنداں ضرورت نہیں۔ چارج شیٹ میں ذاتی' گھریلو' دفتری یعنی سب معاملات کا مذکور ہوتا ہے۔ مثلاً ماسٹر عبدالکبیر کو یہ لکھ کر چلتا کر دیا گیا کہ معلوم ہوا ہے آپ اس عمر میں طاقت کے انجکشن لگوا رہے ہیں۔ آپ نے بڑے بیٹے کی شادی پر شہر کے ایک قصاب سے گوشت ادھار لیا تھا۔ قصاب کا بیٹا سکول میں تقاضا کرنے آتا ہے۔ اس کی یہ شکایت بھی ہے کہ ماسٹر جی نے ہماری دُکان کا راستہ ہی بدل دیا ہے' نیز آپ سکول میں معصوم

بچوں کی بے تحاشا مار پیٹ کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

مولوی محمد انوار کے چارج شیٹ میں مندرج تھا کہ قوتِ سماعت میں خلل کی وجہ سے سکول کی گھنٹی سننے سے قاصر ہیں اور وفورِ نسیاں سے بار بار ایک ہی کلاس میں منہ اُٹھائے چلے جاتے ہیں۔ کئی بار انتباہ کیا گیا کہ چوڑی دار پاجامہ پہننا ترک کریں کیونکہ اس سے گھٹنوں کا کبج اور ٹانگوں کا ضعف نمایاں ہوتا ہے جس سے بچوں کی نفسیات پر بُرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

اسلامیہ میں جبری ریٹائیرمنٹ کے بعد تقریباً ہر مولوی امامت کا پیشہ اختیار کرتا ہے مگر مولوی محمد سمیع نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اتنی عمر خوفِ خدا سے نماز ادا نہ کی اب چند روپوں کی خاطر

آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہونگے

مولوی محمد انوار نے بھی ایک مسجد کی امامت کا چارج سنبھالا۔ اس محلے میں ان کے مقتدی کم معتقد زیادہ تھے۔ کچھ وقت گذرا کہ ان کے مقتدیوں اور معتقدوں میں ٹھن گئی۔ ایک دفعہ دونوں گروہوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ کہتے ہیں مولوی صاحب نماز پڑھا رہے تھے کہ قرأت میں سورت کی کچھ آیات چھوٹ گئیں۔ مقتدیوں نے بہتیرا لقمہ دیا مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ جب نماز انجام پائی تو بکھیڑا کھڑا ہو گیا۔ مولوی صاحب کے کان میں جب بات پڑ گئی تو معترضین کو ایک صف میں کھڑا کر کے پوری سورت فر فر پڑھ ڈالی۔ معتقدوں نے نعرے بلند کئے۔ ''نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، اسلام زندہ باد''۔ کہتے ہیں بعض نے الگ سے نماز ادا کی۔ مولوی صاحب اس واقعے سے

بہت دل برداشتہ ہو گئے۔ طبیعت بگڑ گئی اور پایانِ کار صاحبِ فراش ہوئے۔
ایک روز میں مزاج پرُسی کے لئے گیا تھا۔ قوتِ سماعت، بصارت اور یادداشت میں کون سی چیز زیادہ مضمحل ہو گئی تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ دونوں آنکھوں میں موتیا بند اُتر چکا تھا۔ سر پر پرانے زمانے کا کنٹوپ، ایک ڈھیلے بنیان میں مٹھی بھر ہڈیاں جیسے ہارمونیم کی غلاف میں بانسری۔ بیٹے نے مشکل سے اٹھا کے تکیے کے سہارے بٹھا دیا۔ مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد پوچھا: ''آپ کون ہیں''؟ میں نے اپنا نام بتا دیا۔ پھر پوچھا: کون؟ میں نے نام مع ولدیت بتا دیا تو بولے: ''مگر ضمیر احمد تو کہہ رہا تھا کہ آپ ہیضے میں فوت ہو چکے ہیں۔''

ساری گفتگو میں ان مردہ اشخاص کا نام لیتے رہے جوان کے قریب یا دور کے تعلق دار رہ چکے تھے۔ میں نے ان کے بیٹے سے مرض کی کیفیت پوچھی تو اس نے کہا کہ نسیان کی بیماری ہے۔ مگر میرے خیال میں مولوی صاحب نے اس جنم کا چولا اُتار کے کسی اور جنم میں پناہ لی تھی۔

خدا مغفرت کرے!!!!..........(یہاں پر چاچا کا بیان ختم ہوتا ہے)

☆☆☆

دام ہمرنگِ جبیں بود

ہمارے بزرگ ہمیشہ حفظِ مراتب اور حفظِ ماتقدم کی سخت تلقین کرتے تھے۔ حفظِ مراتب کی پاسداری میں نہ صرف ہمارے گھٹنوں میں دائمی مرض پیدا ہوگیا بلکہ کئی دفعہ مختلف اعضاء میں فریکچر بھی ہوا ہے۔ والد صاحب لاٹھی اٹھا کے ہمارے جسم پر چوب کاری کرنے لگتے تو ہم کسی بھی طرح سے ان کے عمل میں مزاحم نہیں ہو سکتے تھے، حتیٰ کہ ہمارا ہاتھ، آنکھ اور گردن میں سے کسی بھی چیز کو اٹھانا بغاوت تصور کیا جاتا جس کی سرکوبی کے لئے اگر ضرورت پڑتی تو ہمارے چاچاؤں کی کمک بھی منگوائی جاتی۔ والد کے قہر سے بچنے کے صرف دو راستے تھے۔ پہلے ہم دوسرا راستہ بتاتے ہیں وہ یہ تھا کہ ہم تب تک بے حس و حرکت بیٹھے رہتے جب تک کہ دو چیزوں میں سے ایک وقوع پذیر نہ ہو جاتی، یعنی یا ان کا اشتعال کم ہو جاتا یا پھر لاٹھی ٹوٹ جاتی۔ ''Whichever was earlier''۔ پہلا راستہ یہ تھا کہ ہم بھاگ کھڑے ہو جاتے جس کا انہوں نے شاذ ہی موقعہ دیا کیونکہ وہ کس بات پر کب، کیسے، کیوں، کہاں اور کتنے بھڑک اٹھتے یہ ہمیں کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ غصے، بے دلی، کڑواہٹ، نفرت اور انتقام کا خوفناک ایکسپریشن رہتا تھا، ایک ایسا تاثر جو ہم

جیسوں کے چہرے پر پودین ہرا پینے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایکسپریشن ان کے لئے ایک قسم کے کیموفلاج کا کام کرتا تھا۔

دام ہمرنگ جبیں بود گرفتار شدم

قصہ مختصر ہم بچپن سے لے کر جوانی تک ایک ایسے تختے کی صورت بنے رہے جس پر ہمارے بزرگوں نے مشق سخن کے ساتھ ساتھ مشقِ دہن بھی خوب طرح سے کی۔ رہی بات حفظِ ماتقدم کی تو ہم اپنے چاچا کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی عمرِ عزیز حفظِ ماتقدم میں ہی گذاردی۔ وہ اس قدر محتاط تھے کہ ڈیوٹی پر نکلنے پر پہلے کوائفِ آسمانی کا ضرور مشاہدہ کرتے۔ کہیں افق کے کنارے پر کسی آوارہ بادل کا ہلکا سا ٹکڑا منڈلاتا نظر آتا تو اپنی چھتری کو شیروانی کے کالر میں ٹنگا کر ہی گھر سے نکلتے۔ وہ نصاب کی تیاری میں ہمیشہ ہم سے پہلے ان اسباق کو تیار کرواتے تھے جو منسوخ ہوتے تھے۔ فرماتے تھے کہ انسان غلطی کا پُتلا ہے اور پھر پیپر سیٹر تو کچھ زیادہ ہی انسان ہوتا ہے۔ لہٰذا بعید نہیں کہ کچھ سوال منسوخ شدہ اسباق میں سے بھی پوچھ بیٹھے۔ پھر امتحان ہال میں شور وغوغا کرنے اور آنسر شیٹ پھاڑنے سے بہتر یہی ہے کہ کسی کونے میں بیٹھ کر سب سوالات حل کئے جائیں۔ ہم نے جو بھی امتحانات چاچا کی ذاتی نگرانی میں پاس کئے ان سب میں ہمیں تھرڈ ڈیویژن سے زیادہ نہیں ملا جس کی وجہ یہی ہے کہ ہم منسوخ شدہ اسباق کی تیاری میں زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔

ہم نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اتوار کی شام کو ہی نہایت دیدہ زیب اور

خوش خط جوائننگ رپورٹ لکھ ڈالی۔ ''زیر آرڈر نمبر'' اور ''بتاریخ'' کے آگے تھوڑی سی جگہ چھوڑ دی۔ اس کے بعد جو بھی کام ہم نے کئے حفظِ ماتقدم کے طور پر ہی کئے۔ یعنی سویرے کھانا کھایا' سویرے بستر میں چلے گئے' اگرچہ خوف اور خوشی سے نیند نہیں آئی پھر بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر خود کو تسلی دیتے رہے کہ ہم گہری نیند سو رہے ہیں۔ اتنے سویرے بیدار ہو گئے کہ دروازہ کھول کے جو باہر دیکھا تو اندھیرے اور سناٹے سے ہول آ گیا۔

☆☆☆

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

جس وقت ہم گھر سے روانہ ہوئے اس وقت وال کلاک میں نو بج چکے تھے۔ گھر سے سکول تک پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا مگر یہ مسافت ہم نے پانچ منٹ میں کیسے طے کی یہ سوچ کر ہم اب بھی حیران ہیں۔ سکول کا گیٹ بند تھا۔ راستہ دونوں طرف سنسان۔ نہ آدم نہ آدم زاد، یا وحشت!! اچانک ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا چلا، پتوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کاروبارِ زیست اب بھی رواں ہے۔ شامتِ اعمال سے ہم نے سوچا کہ کچھ نزدیک سے سکول کی عمارت کا معائینہ و مشاہدہ کیا جائے۔ دیوار پھاند کے اندر گئے۔ پھاٹک سے عمارت تک ایک خوبصورت روش جاتی تھی جس کے دونوں طرف سفیدے کے نوجوان پیڑ اِستادہ تھے۔ اس روش پر خرام کرتے ہوئے ہمیں یکبارگی سے لگا کہ جیسے ظلِ الٰہی دربارِ خاص میں جلوہ افروز ہونے کے لئے قدم رنجہ فرما رہے ہیں اور مصاحب دونوں طرف سر جھکا کے دست بستہ کھڑے ہیں ۔ ابھی ہم تخت تک پہنچے ہی نہ تھے کہ تختہء دار کے داروغہ نے آن لیا۔ ہمارے سامنے ایک خاکروب جھنڈے کی طرح جاڑو کندھے پر اُٹھا کر نمودار رہوا۔ نہایت ہی بدتمیزی سے کہا کہ چلو صاحب بُلاتے ہیں۔ کچھ ہی دور چلے تھے کہ ایک اور خاکروب نے ہمیں دائیں

طرف سے اسکاٹ کیا۔ہمیں لگا کہ جیسے ہم کوئی خطرناک مجرم ہیں اور ہمیں سخت حفاظتی گھیرے میں کسی نامعلوم جگہ پر منتقل کیا جارہا ہے۔سکول کے احاطے کو پار کرکے کالج کے احاطے میں آگئے۔ہمیں دور سے ہی تختہءدار نظر آیا۔ادارے کے سکریٹری سوٹ میں ملبوس اپنے کوارٹر کے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ ہم نے دور ہی سے حفظِ ماتقدم کے طور پر سلام کیا۔انھوں نے سلام کو نظرانداز کرکے فرمایا: ''یہ آپ اسمگلروں کی طرح آنکھوں پر کالا چشمہ چڑھائے بے وقت سکول کے احاطے میں کس چیز کا مشاہدہ کررہے ہیں؟''۔ہم نے رسان سے دھوپ کا چشمہ اتار کے پتلون کی جیب میں رکھا اور عرض کیا: ''جناب ہم سکول میں ٹیچر appoint ہوئے ہیں اور جوائن کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں''۔فرمایا: ''Appointment Letter ہے''؟ عرض کیا: ''جی نہیں ابھی تک موصول نہیں ہُوا'' ارشاد ہوا ''پھر کس دبنکور نے آپ سے کہا؟''۔ہم نے عرض کیا: ''جناب سکول کے چپراسی نے مطلع کیا''۔فرمایا: ''اس پدرسوختہ نے کس وقت حاضر ہونے کو کہا تھا''؟ ہم نے کہا: ''جی دس بجے''۔حالانکہ خود ان کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی پھر بھی پھولوں کی کیاری میں کام کرنے والے باغبان کو آواز دی ''ارے سبحان صاحب! ذرا ماسٹر جی کو وقت بتادیجئے۔'' باغبان نے روئے سخن ہماری طرف کرکے وقت بتادیا ''جی سوا نو''۔ہم سوچ ہی رہے تھے کہ محمد سبحان اور ہم میں سے ان کے طنز کے تیر کا نشانہ کون تھا کہ انھوں نے پھر سے وار کیا: ''ہمارے ماسٹر جی اکثر ہمیں دبنکور اور پدرسوختہ کے القاب سے یاد کرتے تھے،ہم نے انٹرویو میں بھی آپ سے ان الفاظ کے مفہوم پوچھے تھے۔آپ سر جھکا کے خاموش

ہو گئے تھے، بتایئے ان کے کیا معنی ہیں''؟ ہم نے کہا جناب یہ دونوں الفاظ فارسی کے ہیں''۔ فرمایا ''تو؟'' ہم نے عرض کیا ''تو ہمیں فارسی اتنی زیادہ نہیں آتی'' ارشاد ہوا ''مگر انٹرویو میں تو آپ نے کئی فارسی اشعار بولے تھے، اچھا یہ بتایئے، گھر میں گائے ہے؟'' ہم نے کہا جی نہیں۔ فرمایا ''پھر دودھ کہاں سے آتا ہے؟'' ''جی ہمسایہ کے یہاں سے''۔ فرمایا ''یعنی ہمسایہ کے یہاں گائے ہے؟''۔ جی میں آئی کہ کہدوں کہ نہیں انکے یہاں آپ کی دعاؤں سے بیل ہی دودھ دیتا ہے، جو سارے محلے میں سپلائی ہوتا ہے، آپ کو بھی دو چار لیٹر پلادوں؟ ذرا سی خاموشی کے بعد پھر سے فائیر ہوا، فرمایا: ''انٹرویو میں آپ نے کہا تھا کہ آپ شعروشاعری سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ ہم نے سُنا ہے کہ عاشقی شاعری کی غذا ہے، تو آپ عشق بھی فرماتے ہونگے، اچھا یہ بتایئے کہ آپ اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو صفحہء قرطاس پر بھی اُتارتے ہیں یا پھر سینہ بہ سینہ ہی منتقل کر رہے ہیں (سینہ بہ سینہ کہتے وقت انھوں نے آنکھ ماری تھی)۔ سُنیے یہ پبلک سکول ہے کوئی دبستان نہیں جہاں آپ کے نالے سن کر بلبلیں غزل خواں ہوجائیں گی۔ یہاں کی زمینوں میں طبع آزمائی کرنے سے اجتناب کریں۔ اور ہاں یہ جو آپ نے شانوں پر گھنگھور زلفیں پریشان رکھی ہیں ہر چند کہ ایسا اگلے زمانوں میں شہزادوں، فلسفیوں، مفکروں، فنکاروں اور دانشوروں کا وطیرہ تھا مگر اس دور میں نقلی درویش، چرسی اور مجذوب ہی گیسو دراز ہوتے ہیں۔ اُمید ہے آپ سب سمجھ گئے ہوں گے۔

☆☆☆

گاؤزوری

پیرزادہ ماسٹر سعدؔ الدین ادارۂ فلاحِ مسلمین کے دیرینہ ہمدردوں میں سے تھے۔ خاندانی وضع کے ساتھ ساتھ طبیعت میں حددرجہ نفاست اور اراکین انتظامیہ کے لئے اسی قدر کدورت تھی۔ گرم رفتار اور نرم گفتار تھے۔ ہم نے کبھی اُن کے مُنہ سے جھوٹ کو چھوڑ کر لغو یا ناشائستہ کلام نہیں سُنا۔ جب بھی انتظامیہ کے مظالم کا ذکر ہوتا تھا تو متعلقین کے لئے وہی لفظ استعمال کرتے تھے جس سے اہلِ اسلام ابلیس کی اس لئے تواضع کرتے ہیں کہ ملّت کی ضلالت اور رَذالت کی وجہ وہی ہے۔ ماسٹر جی اکثر کہا کرتے تھے کہ ادارۂ فلاحِ مسلمین کے درجات وقت اور منتظمین کی نیت کے ساتھ بدلتے گئے اور یہ بتدریج ادارۂ فلاحِ مسلمین سے پہلے فلاحِ مسلمات اور بعد میں ادارۂ فلاحِ کافرین وکافرات ہوگیا۔ ایک دن ہم سے کہا کہ بیس برس سے اس ادارے کی خدمت پر مامور ہوں اب مجھ روسیاہ کو خدمتگار کی جگہ ادارے کا نمک خوار بلکہ سفتہ گوش کہا جاتا ہے۔ یہ جو عالیشان عمارتیں کھڑی ہیں ان کے رنگ و خشت وسنگ میں میرا خون لگا ہے۔ ماسٹر شاہ عبداللطیف کا البتہ یہ کہنا تھا کہ سعدالدین کی خون سے مراد خونِ جگر ہے جو صرف شعرائے کرام بہاتے ہیں۔

شاہ صاحب یہ بھی کہتے تھے کہ سعد الدین سابق منتظم اعلیٰ کے خاص معتمد اور ہمراز تھے اور دونوں نے ایک دوسرے کے تعاون اور اشتراک سے خوب ساز باز کیا لیکن جب گٹھ جوڑ دُنیا پر کھل گئی تو سعد الدین پر سارا الزام دھر لیا گیا۔ چنانچہ نوکری سے برطرف کر دیئے گئے۔ نئی انتظامیہ نے پرانی انتظامیہ سے انتقام لینے کی غرض سے تمام مردود اور متروک پھر سے رکھ لئے۔ اس سلسلے میں اس متخطی کو بھی پھر سے بحال کر دیا گیا۔ موصوف کے دو لخت ہائے جگر بھی اسی ادارے کے تنخواہ دار ہیں۔ تینوں باپ بیٹے ادارے کے مشاہرے سے ایک دوسرے کی کفالت کر رہے ہیں۔ گائے اس پر مستزاد ہے۔ ہزار دفعہ تنبیہہ ہو چکی ہے مگر بے سود۔ ایک دن تحریری انتباہ ملا کہ عرصۂ دراز سے آپ اپنے ہمراہ گائے لاتے ہیں جو دن بھر سکول کے گراونڈ میں گھاس چرتی ہے۔ آپ یہاں بچوں کو پڑھانے آتے ہیں یا گائے کو گھاس چرانے؟ کئی طلباء کے والدین نے شکایت کی ہے کہ ان کے بچوں سے گاؤبانی کا کام لیا جا رہا ہے۔ بعض کے ٹفن کیریئر سے دودھ برآمد ہوا ہے۔ بچے آپ سے زیادہ آپ کی گائے سے مانوس ہو چکے ہیں۔ اگر یہ Practice فوراً بند نہ ہوئی تو انتظامیہ کو مجبوراً آپ تینوں کو گائے کے ساتھ برطرف کرنا پڑے گا۔ جواب میں سعد الدین نے لکھ دیا کہ حیوان کے جُرم میں انسان کو دھر لینا سراسر غیر قانونی ہے۔ گائے کوئی انسان نہیں کہ بہلا پھسلا کر یا خوف زدہ کر کے سمجھایا جا سکے۔ راقم الحروف نے ہزار دفعہ اس ناہنجار کو چکمہ دینے کے لئے راستہ بدل دیا۔ ساری کوششوں کے باوجود موصوفہ اپنی حرکت سے باز نہیں آئی کیونکہ

اسے یہ لت والدہ کی حیات میں ہی لگ گئی ہے۔ مرحومہ خود اس ادارے کی نمک خوار تھیں۔ راقم الحروف نے اس سے قبل بھی سیکریٹری صاحب سے معذرت کی جو انہوں نے قبول بھی فرمائی کیونکہ وہ بھی موصوفہ کے شیر (خوار) ہیں۔ برخوردار! میں اس وضاحت سے قطعی متفق نہیں ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ سعد الدین کی گائے آوارہ اور روگرداں ہوگئی ہے اور گائے کو موصوفہ اور اس کی ماں کو والدۂ مرحومہ کہنا گاؤزوری کے سوا کچھ نہیں۔

☆☆☆

ہم بھی پروفیسر ہو گئے

چونکہ ہم کسی کلاس کے فارم ٹیچر نہیں تھے لہٰذا ہمیں کوئی چارج نہیں دیا گیا۔ اس بات پر سخت افسوس ہُوا کہ چاچا نے چارج لیتے وقت جس احتیاط کی ہدایت دی تھی اُس سے ہم محروم ہو گئے۔ ہمیں ملول دیکھ کر سکول کے چپراسی نے ہماری ڈھارس بندھائی۔ کہنے لگا حالانکہ بنا کسی چارج کے نوکری کرنا عزتِ نفس کے خلاف ہے مگر آپ خاصے خوش قسمت ہیں کیونکہ یہاں جس نے چارج لیا ہے اُس کے خلاف ایک نہ ایک روز چارج شیٹ ضرور نکلی ہے۔ چارج کے نام پر حاضری کی ایک رجسٹر ہے جس کے سرِ ورق پر انتہا ہی لہجے میں سُرخ روشنائی سے جلی حروف میں (اس نے جعلی بولا تھا) یہ مرقوم ہوتا ہے کہ جملہ حقوق بحقِ ادارہ محفوظ ہیں۔ اس رجسٹر کے گُم ہونے کی صورت میں متعلقہ ٹیچر سے اس کی قیمت مع جرمانہ وصول کی جائے گی۔ پرنسپل صاحب نے اس سال اس سطر کا اضافہ کروایا کہ یہ صرف ادارے کی ملکیت ہے اِسے کسی بھی صورت میں مِس یوز کرنا قانوناً جرم ہے'' مس یوز کہتے وقت چپراسی نے آنکھ ماری اس کی دلچسپ باتیں سن کر میں نے پوچھا ''تمہارا نام کیا ہے''

بولا خاکسار کو نور محمد کہتے ہیں، سیّد نور محمد بخاری، مگر بخاری کی جگہ مجھے چپراسی کہلانا زیادہ بھلا لگتا ہے۔ جناب مجھے چپراسی کی یائے معروف بخاری کی یائے نسبتی سے بابرکت لگتی ہے۔ سنا ہے آپ بھی سیّد ہیں، الحمداللہ، اب ہم کل ملا کر تین سادات ہو گئے، تین کا ہندسہ بڑا مبارک ہوتا ہے۔ سکول کے پرنسپل صاحب بھی سیّد ہیں۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی پوزیشن میں یہ نوکری کرتے ہوئے عزت سادات گنوائی ہے، خدا آپ کا محافظ ہے'' اس کے بعد نور محمد نے ادارے سے وابستہ اہم اور متنازعہ شخصیات کا تعارف کروایا۔ کہنے لگا۔ ''ماسٹر سعد الدین سرکاری سکول میں بنیادی طور پر عربی کے ٹیچر تھے، یہاں بھی اُن کا تقرر عربی معلم کے طور پر ہی ہوا تھا، مگر کچھ ہی دیر میں انتظامی امور میں دخل انداز ہوئے۔ نتیجہ کے طور پر ماسٹر شاہ عبداللطیف کو عربی کا سبجکٹ دیا گیا۔ وہ بنیادی طور پر ڈرائینگ کے ٹیچر تھے۔ چنانچہ اس بات پر سعد الدین کے خلاف ان کے دل میں پرخاش پیدا ہو گئی۔ وہ اس بات پر شاکی ہیں کہ عربی کا سانپ میرے گلے میں ڈال کر قدیم دشمنی نکالی۔ ایک دن مجھ سے کہا کہ عربی زبان کے گردان اس قدر ملٹی کلر ہیں کہ انھیں پیش کرنے کے بعد زبان اس برش کی طرح ہو جاتی ہے جس کے مُوجگہ جگہ سے اکھڑ گئے ہوں۔ حضور ایڈمنسٹریٹر، سکریٹری اور پرنسپل کے درمیان سرد جنگ چل رہی ہے۔ تینوں نے اپنے حریفوں پر مخبر لگائے رکھے ہیں۔ یہاں بارودی سرنگوں کی طرح مخبروں کا جال بچھا ہوا ہے لہٰذا قدم اٹھانے اور زبان ہلانے سے پہلے گردونواح کا مشاہدہ ضرور کیجیے۔ ہم تو فوجی کتوں کی طرح بارود کی بُو سونگھنے

میں مشّاق ہو گئے ہیں رفتہ رفتہ آپ کی قوتِ شامہ بھی حالات کے مطابق ہو جائے گی۔

سعدالدین نے تینوں کشتیوں میں پاؤں رکھے ہیں۔ سکریٹری کو دودھ پلاتے ہیں۔ ایڈمنسٹریٹر کو مکھن لگاتے ہیں اور پرنسپل کو بلیک میل کرتے ہیں۔ سیکریٹری کو سب معلوم ہے وہ سعدالدین سے پنڈ چھڑانا چاہتے ہیں مگر اس کے لئے اُنھیں اپنا دودھ چھڑانا پڑے گا۔ پرنسپل نے ہر ٹیچر کو پروفیسر کے لقب سے ملقب کیا ہے البتہ سبک دوش بزرگوں کو ان کے نام ہی پکارتے ہیں ۔مجھ پر کافی مہربان ہیں کہتے ہیں کہ تم سیدّ زادے ہو، تمہاری تعلیمی قابلیت بھی بہتر ہے۔ تخلیہ میں مجھے بھی پروفیسر ہی کہتے ہیں'' نورالدین کے چہرے پر عجیب طمانیت تھی۔ اس واقعے کے قریب دس برس بعد ہمارا تقرر کالج میں لیکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ نے مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ ''یونیورسٹی میں پروفیسر بننے کے لئے ہمیں کئی برس کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور چارو ناچار کئی کتابیں تصنیف کرنے کی زحمت اٹھانا پڑتی ہے، جبکہ کالج میں آتے ہی لیکچرر پروفیسر ہو جاتا ہے۔ بھئی مبارک ــــ ہو تم بھی پروفیسر ہو گئے''۔

☆☆☆

کام کتّے کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

کچھ دن ہوئے کہ پرنسپل کا بلاوا آ گیا۔ بڑے تپاک سے مصافحہ کیا اور خلوص سے بٹھا کر فرمانے لگے...... ''پروفیسر صاحب آپ کی کارکردگی اور سرگرمیوں سے انتظامیہ بہت خوش ہے۔ کل اوپر سے مجھے ایک Confidential Communication موصول ہوئی جس میں آپ کے بارے میں خفیہ رپورٹ بھیجنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ابھی میں آپ کی Teaching Skill کے بارے میں وثوق سے کچھ کہہ نہیں سکتا، البتہ آپ نے کچھ ہی دنوں میں جو انقلاب سکول میں برپا کیا ہے اس کے لئے آپ تعریف وتحسین کے بے شک مستحق ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی مجھے لگا تھا کہ آپ صرف زیبِ محفل ہی نہیں بلکہ وقت آنے پر شریک شورش محفل بھی ہو سکتے ہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ آپ پنجگانہ نماز کے بھی پابند ہیں، ماشاء اللہ، یعنی ابھی ایسے جوان موجود ہیں جو جہاں گیری، جہاں داری، جہانبانی اور جہاں آرائی کے جذبے سے معمور ہیں۔ جو اپنے سینوں میں توحید کی امانت سنبھال سکتے ہیں۔ آپ نے بھیانک مار پیٹ سے سٹوڈنٹس کے دلوں میں دہشت بٹھا دی ہے۔ نتیجہ یہ کہ جو کلاس رومز کل تک شورش زدہ تھے آج ان میں قبرستانوں کا سناٹا

چھایا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ کوئی سٹوڈنٹ اگر گھر میں شرارت کرتا ہے تو ماں کہتی ہے باز آؤ ورنہ نئے ماسٹر جی سے شکایت کروں گی۔ آپ کے بعض رفقائے کار بھی بدمعاشیوں سے یا تو پرہیز کرنے لگے ہیں یا انہیں درپردہ انجام دے رہے ہیں۔ کئی والدین نے آپ کے لئے تحسین اور آفرین کے کلمات بھیجے ہیں۔ چونکہ آپ خراشِ عقدۂ مشکل سے شناسا ہیں اس لئے آپ کو سکول کے اہم معاملات میں اپنی خدمات پیش کرنے کا موقع ضرور ملتا رہے گا۔'' موصوف ستائش کے گھوڑے پر سوار کر کے بحرِ ظلمات کی آخری سرحد تک دوڑا بلکہ کھدیڑ چکے، تو ہمیں احساس ہوا کہ کسی خطرناک مہم کا سامنا ہے۔ کیونکہ جس طرح وہ ہم پر آدابِ خود آگاہی اور اسرار شہنشاہی منکشف کر رہے تھے اس سے ہمارا ماتھا مسلسل ٹھنک رہا تھا۔ فرمانے لگے...... ''سٹوڈنٹس کی شورش کا تو آپ نے بخوبی قلع قمع کیا ہے اب کتوں کی سرکوبی کے لئے کمربستہ ہو جایئے۔ آپ متوحش اور متردّد نہ ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ پرائمری کلاس کے بچوں کو رِسس کے وقت سکول کے صحن میں لنچ کھلایا جاتا ہے۔ آس پاس کے کتے ضیافتوں کی خوشبو پا کر چاردانگ سے یورش کرتے ہیں۔ حالانکہ ہر محاذ پر ایک فرد محافظت پر مامور ہوتا ہے مگر یہ بدبخت عین اسی وقت ہڑبونگ مچاتے ہیں جب ایڈمنسٹریٹر صاحب معائینے پر نکلتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کتے ایڈمنسٹریٹر کی نظروں میں ہمیں ذلیل و خوار کرنے کی غرض سے ایسی حرکات جان بوجھ کر کرتے ہیں۔ ایک صاحب تو قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اس نے عین اس وقت جب ایڈمنسٹریٹر کتوں کی بدمعاشیوں کی وجہ سے ہم پر دھاڑ رہے

تھے دیکھا کہ کتے ایک دوسرے کو مسکراتے ہوئے اشارہ کررہے تھے' واللہ اعلم بالصّواب' آپ سراسیمہ کیوں ہو گئے؟'' ہم نے عرض کیا کہ حضور یہ میونسپلٹی والوں کا کام ہے ایسے بدمعاش کُتوں کی بغاوت کو دبانے کے لئے تو پوری کمان کی ضرورت ہے۔'' فرمایا...... ''میونسپلٹی حکام کو کئی دفعہ مطلع کیا گیا ہے' ایک دن وہاں سے ایک جمعدار آیا تھا۔ میں نے صورتحال سے آگاہ کر کے کہا تھا کہ اس سے قبل آپ کوئی سنگین قدم اٹھائیں میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ اس نالائق نے کہا کہ مشورہ آپ کُتوں کو دیجئے ہمیں کچھ رقم کی ضرورت ہے جس سے زہر خرید کر ان کمینوں کو ٹھکانے لگا سکیں' کیونکہ آج کل میونسپلٹی میں زہر کی بڑی شاٹیج چل رہی ہے۔ میں نے پوچھا زہر کھلانے کے بغیر کوئی دوسرا راستہ نہیں تو کمبخت نے دامن جھاڑتے ہوئے کہا کہ اگر آملیٹ کھلانے سے کام چل سکتا ہے تو چلایئے' خدا حافظ'...... کُتوں کو سکول بدر کرنے کی ایک سکیم میرے پاس ہے۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہو گا کہ جال بچھا کر انہیں گرفتار کرنا چاہیئے پھر ایک ٹرک میں لاد کر کسی گمنام جگہ پر...... ہم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا مگر اس کے لئے تو مچھیروں کی خدمات درکار ہیں'' بولے یہ نکتہ میں ہائی کمان سے Discuss کروں گا' فی الحال آپ کل سے رِسس پر موجود رہیں شکریہ' آپ جا سکتے ہیں۔

اس نئی مصیبت کی روداد ہم نے چپراسی سے بیان کی۔ وہ کہنے لگا کہ میرے خیال میں کتوں کو شوٹ کرنا چاہیئے:

رگِ سگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا

صاحب جن کتوں کے خلاف آپ تحریک مزاحمت چلانے کی غرض سے تیغ وکفن باندھے جارہے ہیں ان کی خصلت پر فارسی کا ایک مقولہ فٹ بیٹھتا ہے کہ سگ صاحب خودرانمی شناسد۔ آج تک خود پرنسپل صاحب کی ٹانگیں دو دفعہ لقمۂ سگ بن چکی ہیں۔ پہلی دفعہ کا مجھے معلوم نہیں البتہ دوسری دفعہ میرے سامنے ایک کتے نے ان کی ران سے بوٹی نوچ لی تھی:

کام کتے کا بقدرِ لب و دندان نکلا

ڈاکٹر نے چودہ انجکشن پیٹ میں لگوانے کی ہدایت دی، مگر انہوں نے اس پر عمل نہ کیا جب ریاضی کے ٹیچر ماسٹر عبدالصمد دلگیر نے غفلت کے نتائج مع چند بھیانک مثالوں کے بیان کئے تو انہیں ڈانٹ کر کہا ''بھنبھنانا بند کرو، یہ کتے تم سے زیادہ Qualified ہیں۔

☆☆☆

اب یہ ہنگامہ اے ہوا کیا ہے

والد صاحب جب تک بقیدِ حیات تھے ہم اپنے دوستوں کا مطالبہ اس دلیل کے ساتھ رد کرتے تھے کہ چونکہ بزرگوار وجعِ مفاصل میں مُبتلا ہیں لہٰذا ہمارے گھر میں کسی بھی صورت میں پنکھا نہیں لگ سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ والد صاحب کی نظروں میں دستی پنکھا بھی عیاّشی کے زمرے میں آتا تھا اور ہمیں گویا دستی پنکھا صرف مکھیوں اور مچھروں کو اُڑانے کی غرض سے استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ خود وہ دستی پنکھے کی ڈنڈی سے اپنا کان کھجانے اور ہمیں ڈرانے دھمکانے کا کام لیتے تھے۔ مرصّع، مجسع اور مزّین پنکھے کی موجودگی کو وہ کبر، غرور اور گھمنڈ سے تعبیر کرتے تھے۔ حالانکہ بزرگوار نے اکتوبر کے مہینے میں برضا ورغبت رحلت فرمائی اور ہماری طرف اس موسم میں دل جلوں کے علاوہ صرف وہ لوگ پنکھا استعمال کرتے ہیں جو حسد، ہوس اور انتقام کی آگ میں ہمہ وقت جھلستے رہتے ہیں، لیکن ہمیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ آنے والی گرمیوں میں ہم کیا بہانہ بنا کے دوستوں کے مطالبے کو مسترد کریں گے۔ اس وقت ہمیں والد کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا۔

ایک دن ہمارے دوست پرویز احمد نے کہا کہ الطاف حسین کے یہاں ایک ٹیبل فین (بیکار) پڑا ہے کہد وتو اسے سستے داموں دلا دوں؟ حالانکہ ٹیبل فین کے بارے میں ہمارا یہ خیال ہے کہ اس کی موجودگی سے افرادِ خانہ میں ایک دوسرے کے خلاف بغض اور عناد پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ ہر فرد یہی چاہتا ہے کہ پنکھے کا روئے سخن کسی اور روسیاہ کی طرف نہ ہو لیکن سستے دام سنکر ہم کسی حد تک آمادہ ہو گئے۔ الطاف حسین کے نوکر نے اسٹور سے ان کے (یعنی الطاف حسین کے) دادا مرحوم کے وقت کا ایک قدیم پنکھا نکال کے ہمارے سامنے رکھ دیا۔ پہلی نظر میں یہ ہمیں کچھ عجیب وغریب شے معلوم ہوئی جس پر کئی زمانوں کی گرد جمی ہوئی تھی لیکن Excavation کے بعد جو آثار نمودار ہوئے اُن کو دیکھ کر لگا کہ یہ ایک زمانے میں پنکھا رہ چکا ہوگا۔ بہر کیف پنکھے کو آن کر دیا گیا۔ ایک ہیبت ناک چیخ کے ساتھ گرد و غبار کا بم پھٹ گیا۔ پتہ نہیں کِن کِن چیزوں کے پُرزے ہوا میں بکھر گئے۔ مشاہدین اس قدر غبار آلودہ ہوئے کہ کچھ دیر کے لئے ایک دوسرے کو پہچاننے سے قاصر رہے۔ غبار کشی کے اس ہیبت ناک عمل کے بعد پنکھا بالکل خاموش ہو گیا۔ خاموشی اس چیخ سے بھی ہولناک تھی جو پنکھے کے آن ہونے پر برآمد ہوئی تھی۔ بعد ازاں پنکھے سے ایسی آوازیں آنے لگیں جنہیں سُن کر ہمیں لگا کہ جیسے ریڈیو کشمیر کے میڈیم اور شارٹ ویو سے ہمارے دوست ڈاکٹر رفیق مسعودی کی مصنوعی ہنسی کے صوتی اثرات براڈ کاسٹ ہو رہے ہیں۔ پھر یکا یک پنکھے کے زنگ آلودہ بلیڈ حرکت کرنے لگے۔ ایک بلیڈ میں رفتار شکن ڈینٹ ہونے کی وجہ سے پنکھا لرزنے

کے ساتھ ساتھ شطرنج کے پیادے کی طرح ایک قدم کی چال آگے کی طرف چلنے لگا۔ اس پورے گھمسان میں یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ پنکھا زیادہ چل رہا ہے، ہل رہا ہے یا آگے کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ یہ بات ہمیں پرویز احمد سے بعد میں معلوم ہوئی کہ پنکھا کرنٹ بھی مارتا تھا۔ ہمارے چہرے پر دہشت دیکھ کر الطاف حسین نے پنکھا سویچ آف کر دیا اور بڑی شفقت سے ہمارے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ''بولو کیا کہتے ہو؟''۔ ہم نے آوازوں کے صدمے سے باہر آ کر اسی شفقت سے عرض کیا کہ غریب نواز! ہمارے خیال میں یہ پنکھا تمہارے دادا جان مرحوم کے کریکٹر کی آخری یادگار ہے، ایسے سرکش پنکھے کو زنجیر کرنے کے لئے ہمارے کمرے میں جگہ نہیں، اور چلو زنجیر کر بھی دیا، مگر اسے جو PARKINSONS کا دائمی مرض ہے اس کا علاج کون کرے گا، ہاں کسی بزرگ کو یہ عارضہ لاحق ہو تو سرکاری ملازم ڈاکٹر سے سند لے کر انکم ٹیکس میں چھوٹ حاصل کر سکتا ہے۔

☆☆☆

سینما ہال کا غسل

کسی زمانے میں بعض مولویوں نے، جو فلم بینی کے شوقین تھے، مقامی سینما گھر کی انتظامیہ کو ہال سے پنکھے اُٹھانے کا مطالبہ کیا تھا، ان کا کہنا تھا کہ پنکھوں کی ہوا کے بے تمیز جھونکوں سے ان کی برقعہ پوش بیگمات بے پردہ ہو جاتی ہیں، شہر کا ایک معززّ حلقہ بھی ان کا ہم نوا ہوا تھا، مگر ان کی پرابلم دوسری تھی۔ وہ کہتے تھے کہ پنکھوں کی ہوا کے شور میں دلیپ کمار کے ڈائیلاگ اور ثریّہ کے نغمے دب جاتے ہیں۔ دونوں مسائل کے ازالے کی خاطر انجینئروں کی خدمات حاصل کی گئیں جنھوں نے معائینے کے بعد بتایا کہ فلم ''خانۂ خدا'' دکھانے سے پہلے فائیر بریگیڈ کی پائیپوں سے ہال کو غسل دیتے وقت پنکھوں کے اہم اور نازک اوزاروں میں پانی چلا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ بے قابو ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ناچار پورے ہال میں نئے پنکھے نصب کئے گئے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ سینما کے سٹور میں کچھ پرانے پنکھے اب بھی پڑے ہیں، اگر منیجر سے سلیقے سے بات کی جائے تو ایک پنکھا اونے پونے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ ہمارے دوست نصیر احمد لوگوں کو شیشے میں اُتارنے میں ماہر ہیں لہذا یہ کام ہم نے انھیں سونپ دیا۔ جب وہ خوشخبری لے کر آئے تو ہم نے کہا نصیر احمد! تمہارے والد کے پیرو مرشد کا قول ہے کہ طلاق شدہ خاتون سے نکاح کرنے

اور سکینڈ ہینڈ چیز خریدنے سے پہلے پوری طرح سے تسلی کرنی چاہیئے'' اس پر وہ بولے کہ طلاق شدہ خاتون کے باب میں مرحوم کی مُراد غالباً کریکٹر رہی ہو گی، رہی بات سکینڈ ہینڈ کی تو میرے والد اپنے پیر و مرشد کے جس قول کی روایت کرتے ہیں وہ اس عہد کا ہے جب شاید پنکھا ایجاد بھی نہیں ہوا تھا، بہر کیف سودا پکا ہو گیا۔ پنکھا ہماری تحویل میں دینے کے بعد منیجر نے اپنے آفس کی دیوار سے ایک وال کلاک اُتار کے ہمیں عنایت فرمایا۔ جھاڑن سے وال کلاک کی گرد صاف کرتے ہوئے بولے کہ یہ کلاک مجھے جالندھر کے Distributer نے فلم رام اور شیام کے ساتھ تحفے میں دیا تھا۔ بہر حال یک نہ شد دو شد وال کلاک کو ٹھکانے لگانے کیلئے ایک کیل کی ضرورت تھی جو دیوار سے ہی بہم ہوئی مگر پنکھا کئی روز تک بے گور و کفن لاش کی طرح ہمارے کمرے میں پڑا رہا کیونکہ اسے جس دار پر لٹکانا مقصود تھا اس کے لئے مناسب کیل کا انتظام نہیں ہو رہا تھا، کچھ دن بعد نصیر احمد نے آہنگر سے ''9'' کی شکل کی ایک آہنی نوکیلی سلاخ لائی اور اسے آن کی آن ''6'' کی صورت میں چھت کی ایک کڑی میں گاڑ دیا۔ پھر سارے دوستوں نے مل کر پنکھے کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ چونکہ پنکھا بد کردار آدمی کی طرح کسی Controlling system کا تابع نہیں تھا لہٰذا بجلی کے دو تار اتنی اونچائی پر نصب کیئے گئے جہاں تک ہم پنجوں کے بل اُٹھ سکتے تھے، پاس ہی پنکھے سے منسلک دو تار کیل کے سہارے لٹکا دیئے گئے۔ ویسے بھی ہمارے گھر میں ایسے کئی نقطہ ہائے اتصال موجود تھے لہذا ہمارے لئے کوئی تردّد کی بات نہ تھی۔ وہ گھڑی جب

تاروں کا وصال ہوا کسی محشر سے کم نہ تھی ۔ چونکہ پنکھا کئی برسوں سے تہیہ طوفان کئے ہوئے تھا لہٰذا سمتِ غیب سے وہ ہوا چلی کہ سب دوست دفترِ عمل پیش کرنے لگے ۔ ہوا کے زور سے پہلے طاقچے پر رکھا ہوا گلدان فرش پر آ کر ٹوٹ گیا جس میں سے وہ سگریٹ برآمد ہوئے جو ہم دوستوں سے چھپا کر پیتے تھے ۔ ہمیں گلدان کے ٹوٹنے سے زیادہ سگریٹوں کے ہائیڈ آوٹ کے Expose ہونے کا دُکھ ہوا ۔ پھر الماری کے پٹ خود بخود کُھل گئے اور دیوار سے سر پٹخنے لگے ۔ فرش پر بکھری ہوئی کتابوں کے اوراق اس طرح پھڑ پھڑانے لگے جیسے ڈربے میں داخل ہو کر بلی ادھم مچا رہی تھی ۔ وال کلاک کیل سمیت گر گیا ۔ دیوار پر ٹنگے ہوئے کپڑے پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ لہرانے لگے ۔ بھونچال اور آندھی کے اس ہولناک عرصے میں نفسا نفسی کا عجیب عالم تھا ۔ کوئی دیوار پکڑ کے بیٹھ گیا ۔ کوئی پیٹ کے بل فرش پر دراز ہو گیا ۔ کوئی کمرے سے اس طرح باہر جانے کی کوشش کر رہا تھا جیسے جیمز بانڈ ہیلی کوپٹر کے لینڈ ہوتے ہی ایک ہاتھ میں بریف کیس لئے اور دوسرے سے ہیٹ سنبھالتے ہوئے سر جھکا کر پنکھوں کی حدود سے باہر آتا ہے ۔ وہ طوفان کس طرح تھم گیا ہمیں یاد نہیں البتہ اس دن کے بعد ہمارے کچھ دوستوں اور رشتہ داروں نے ہمارے کمرے سے دور رہنے میں ہی عافیت محسوس کی ۔ رفتہ رفتہ خود بخود ہم پنکھے کے ساتھ، پنکھا ہمارے کمرے کے ساتھ اور دوست ہر دو کے ساتھ Adjust کرنے لگے ۔

البتہ وال کلاک کی سبک رفتاری سے ہم بہت پریشان رہنے لگے ۔ دن

میں کئی دفعہ کنجی گھمانے کے باوجود یہ گرینوچ مین ٹایم سے بیس منٹ پیچھے رہ جاتی تھی جس سے ہمارے سارے امور، اعمال اور کرتوت کی سرانجامی میں خلل واقع ہوا۔ کافی مرمت کے بعد جب کوئی صورت نظر نہیں آئی تو ہمارے دوست شمیم احمد نے ایک دن کہا ''تمہارا کمرہ تمہارے کریکٹر اور شخصیت کی طرح فین اور وال کلاک کی وجہ سے مجموعۂ اضداد بن گیا ہے۔ فین کی سرکشی کے لئے میری تجویز ہے کہ تم بجلی کو اپنے Phase پر لاؤ مگر پھر نارمل کرنٹ کی وجہ سے بلب کی جگہ موم بتی جلانے کی نوبت آئے گی۔ البتہ وال کلاک کا آسان علاج یہ ہے کہ اس کے پیس میکر لگواؤ، انشاء اللہ افاقہ ہو جائے گا''۔

عرصہ ہوا کہ جب ہم نے افراتفری میں گھر سے ہجرت کی تھی۔ اپنی کتابیں اور کچھ ضروری ساز وسامان تو ہم کسی طرح سے اُٹھا کر لائے تھے۔ البتہ فین اور وال کلاک وہیں رہ گئے تھے۔ کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ بتائی ہوئی گھڑیاں یاد آتی ہیں تو دل غم واندوہ کے غبار سے بھر جاتا ہے۔ جگر میں وال کلاک کا کانٹا چبھنے لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اب بھی ہر کام بیس منٹ لیٹ کر رہے ہیں۔

☆☆☆

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں نصاب میں

کہتے ہیں کہ ایک دن پروفیسر سندر لال راز دان نے Highwayman (انگریزی شاعر ALFERD NOYES پیدائش 16 رنومبر 1880ء، وفات 28 رجون 1958ء کی ایک مشہور نظم) پڑھاتے ہوئے Tlot,Tlot کا ترجمہ تر بچھ تر بچھ بتا دیا، پس اسی دن سے بعض شریر لڑکوں نے ان کا نام تر بچھ خان رکھ دیا۔ ہم جب کالج میں آئے تو تر بچھ خان سے T.K بن گئے تھے۔ قد کاٹھی اور وضع قطع سے پشاوری پٹھان لگتے تھے اس لئے ہمیں T.K پر تجمل خان کا التباس ہوا، جس کو نظر بد سے بچانے کیلئے خدا نے غالبؔ کے بقول خلق پر بھی عنایت کی تھی۔ انگریزی جتنی اچھی بولتے تھے اتنی ہی بُری پڑھاتے تھے۔ ہفتے میں دو تین دن کالج سے غائب رہتے، باقی ماندہ دنوں میں یہ کہہ کر کلاس سے گریز کرتے تھے کہ فرنگ سے آئے ہوئے گورے دوستوں (اور سانولے رشتہ داروں) کی خاطر تواضع سے تھکان ہوگئی ہے۔ ان کے کسی رفیق کار نے البتہ بتایا تھا کہ لال چوک میں مشہور مے فروش لب کول کے بار (BAR) میں اپنے ہم مشرب دوستوں کے ساتھ عالمی حالات پر دانشورانہ بحث میں مصروف رہتے تھے اور فرنگ

سے مہمان ان کے خیالوں میں وارد ہوتے تھے۔

تدریس کا عمل شروع ہونے کے ایک ماہ بعد کمال مہربانی سے ہمیں حکم دیا کہ ایک اجلاس فسٹ ائیر کے انگلش لٹریچر والوں کا منعقد کرو کیونکہ تدریس سے پہلے تعارف اور تفتیش ضروری ہے۔ بارے خوب اچھی طرح سے خود کو ہم سے اور ہم کو خود سے متعارف کرا کے انگریزی زبان وادب کے مطالعے میں پیش آنے والے بھیانک خطرات پر مبنی ایک عبرت افروز تقریر فرمائی۔ پھر ہمارے منتشر مضامین کی شیرازہ بندی کچھ اس طور سے کی کہ موقعۂ واردات پر ہی دو طلبا نے انگریزی لٹریچر کے ساتھ غدر کیا۔ ہماری طرف روئے سخن کر کے فرمایا کہ شکل وصورت سے تم کسی مفلس، لاچار اور بے کس گھرانے کے بجھے ہوئے چراغ معلوم ہوتے ہو، اب چونکہ مزید تعلیم کیلئے بضد ہو تو بہتر تمہارے لئے یہ ہے کہ تم اُردو اور عربی کے ساتھ فارسی کا مضمون اختیار کرو کیونکہ ایران صغیر میں انگریزی لٹریچر پڑھ کے دربدر کی خاک چھاننے سے بہتر ہے کہ ایران میں اپنی قسمت آزماؤ۔ جی میں آئی تھی کہ کہہ دوں حافظ شیرازی نے اپنے شیرازی معشوق کے دلفریب تل کے عوض میں سمرقند اور بخارا بخش کے وہاں کیا رکھا ہے؟ ہم نے اپنے ایک دوست کی موجودگی میں اس بات کا گھر میں تذکرہ کیا تو بھائی صاحب مشتعل ہو گئے۔ ہمارے دوست سے مخاطب ہو کر کہا کہ میاں! حافظ شیرازی کی قبر کے اس مجوزہ مجاور سے کہہ دو کہ ایسے خوفناک مشورے پر عمل کرنے سے پہلے سوچ لے کہ اس سے قبل اس نے دو برسوں میں دو مضامین تبدیل کر دیئے ہیں۔ انگلش لٹریچر چھوڑنے کی

صورت میں اِسے کالج سے بے دخل اور گھر سے عاق کر دیا جائے گا۔

ریاضی کا مضمون ہم نے اس لئے بدل دیا تھا کہ اس میں سب کچھ فرض کیا جاتا ہے اور نصاب کی کتاب دیکھ کر ہمیں لگا کہ چینی زبان کی کھڑی عبارتوں کو چاروں شانے چت کر کے گنہگار مردے کی طرح لٹا دیا گیا ہے۔ اقتصادیات میں بھی چونکہ ہندسوں اور ٹرائیفک جیسی شکلوں کی (جو خلاف ورزی کے لئے کھمبوں پر مصلوب کی جاتی ہیں) دخل اندازی زیادہ ہے لہٰذا ہم اس سے بھی خائف ہو گئے تھے۔

پروفیسر راز دان نے اس گمان میں کہ ہم نے ان کے زرّیں مشورے پر بے چوں و چرا عمل کیا ہماری کلاس لینا چھوڑ دیا۔ پس ایک دن جو ہماری نافرمانی کی خبر ہوئی پھر گویا ہم بقول شخصے دلِ راز داں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے۔ ہماری مجرمانہ غفلت کی پاداش میں کلاس لینا تو دور کی بات ہے ہمارا منہ دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ ہم نے ایک دن پروفیسر مشتاق احمد وانی سے تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا موصوف دُنیا کا واحد فرد ہے جو اپنے ہی پیٹ پر اپنی ہی لات مار رہا ہے۔ بارے امتحان سر پر آیا تو ہم نے آسمان کے بجائے کتاب سر پر اُٹھا کے ڈرتے ڈرتے اور نہایت ندامت سے التجا کی کہ ہماری نافرمانی اور فرد گذاشت کو درگزر کر کے ان نظموں کی نشاندہی کیجیے جن کے بارے میں امتحان میں سوال پوچھے جانے کا امکان ہے۔ ہم نے ہاتھ جوڑے تو ذرا نرم ہو کے فرمایا کہ ہر چند تمہاری بغاوت کی یہی سزا ہے کہ تم فیل ہو جاؤ مگر مجھے تم نالائقوں کے علاوہ بھگوان کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اس لئے پہلی پانچ نظموں کو

اچھی طرح اور غور سے تیار کرلو، اور یادرکھو ان کے بغیر Paper setter کا جنازہ نہیں اُٹھے گا۔ یہ بشارت ہمارے لئے گویا مژدۂ حیات تھی۔ امتحان میں جب پرچہ ہاتھ میں آیا تو ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین اور زانوں سے سٹول کھسک گیا کیونکہ Paper setter کا جنازہ پہلی پانچ نظموں کے بعد ہی اُٹھا تھا اور میت آخری نظم میں دفن ہوگئی تھی۔ نتیجہ نکلا تو بشمولِ خاکسار دو امیدوار فیل قرار دیئے گئے تھے البتہ ہمارے دوست نصیر احمد کامیاب ہوگئے تھے۔ ہمارے فیل ہونے پر جو شورش والد صاحب نے گھر میں اٹھائی تھی اس میں جب ہماری مار پیٹ اور دیگر لوازمات (از قسم گالی گلوچ، ناروا، ناسزا وغیرہ) افاقہ ہوا، اور ہم نفسیاتی طور پر زمانے کو منہ دکھانے کے قابل ہوگئے تو ہم نے نصیر احمد سے پوچھا کہ تم کیسے پاس ہوگئے۔ انھوں نے لاپرواہی سے کان کھجاتے ہوئے جواب دیا: ''بھئی ہمیں تو قبلہ خان نے اوّل (مضموم) [Kublakhan انگریزی زبان کے عظیم شاعر کولرجؔ کی ایک مشہور مگر ادھوری نظم] نے بچایا۔ ہم نے حیران ہوکر پوچھا: وہ کیسے؟ بولے میں نے ایک روز برادر سے استفسار کیا۔ انھوں نے جو واقعات بیان کئے وہ میں نے اسی ترتیب کے ساتھ جوابی پرچے میں لکھ دیئے۔ نصیر احمد نے قبلہ خان (اوّل تا آخر مذموم) کے بارے میں جو حالات بیان کئے انھیں سن کر ہم سراسیمہ ہوگئے۔ ہم نے کہا: یارِ جانی! خان موصوف کے بارے میں جو تم بیان کر رہے ہو وہ دراصل ہلاکو خان کے خونریز سوانحی کوائف ہیں۔

☆☆☆

بسکہ دشوار ہے
ہر کام کا آساں ہونا

ہم نے اخبار کھولا ہی تھا کہ موبائیل کی گھنٹی بجی۔ جب تک نوکر موبائیل کو ہم تک منتقل کرتا Caller نے فون کاٹ دیا۔ ہم نے پوچھا کون ہے؟ اس نے فون ٹٹول کر بتادیا کہ آپ کے عزیز رشتہ دار معروف احمد کی مثقال ہے۔ ہمارا نوکر Missed Call کو مثقال ہی کہتا ہے اور پھر معروف احمد کی Missed Call مثقال کے برابر ہوتی ہے یعنی ڈیڑھ درہم۔ ہم نے بیگم کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا' ان کے چہرے پر ناگواری کا شدید ایکسپریشن (Expression) پیدا ہُوا۔ وہی ایکسپریشن تھوڑی سی ترمیم اور اضافے کے ساتھ ہم نے اپنے چہرے پر لا کر نوکر کی طرف دیکھا اور اشاروں میں کہہ دیا: نالائق! کتنی بار منع کیا ہے کہ بیگم کے سامنے Missed Calls کا کھاتہ مت کھولا کرو۔'' بیگم کی ناراضگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ معروف احمد صرف ایمرجنسی کے موقعوں پر Missed Call دیتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی رشتہ دار وفات پا چکا ہو' یا پانے کے لئے ہسپتال میں ایڈمیٹ کر دیا گیا ہو' علیٰ ہذا القیاس ہم پہلے ان کی Missed Calls سے خوف زدہ ہوتے تھے' مگر آدمی

جب تقدیر، زندگی اور دنیا کی حقیقتوں کو سمجھتا ہے تو بُری سے بُری خبر سننے کے لئے بھی تیار رہتا ہے، خواہ وہ ٹرانسفر کی ہی خبر کیوں نہ ہو۔ بہر حال ہم نے واپسی فون لگایا۔ معروف احمد نے ہمارے سلام کا جواب دیئے بغیر پوچھا: ''آج کا اخبار پڑھا آپ نے؟'' ہم نے کہا...... ''پڑھ رہے ہیں، کیوں خیریت ہے، کوئی خاص خبر ہے کیا''؟ انہوں نے نہایت درد آمیز لہجے میں اطلاع دی کہ نور خان کا انتقال ہوا ہے۔ ہم نے کہا...... ''آہ! نور خان...... غریب نے اپنی عمر عزیز ہمارے آبائی محلے کی خدمت میں گزار دی۔ چند روز پہلے ملاقات ہوئی تو بہت رویا تھا۔ کہتا تھا آپ اس محلے سے کیا گئے کہ ویرانی چھاگئی ہے۔ یہ تو کہیے کہ مسجد نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی ہے ورنہ جی میں سو بار آیا کہ اپنے وطن جا کے وہیں کہیں پہاڑ کے دامن میں پیوند خاک ہو جاؤں ۔'' ہم نے کچھ رقم دی تھی اُسے لوٹاتے ہوئے بولا تھا...... ''اس کے بدلے گالے دیجئے، فقیر کو کیا لالچ، کس چیز کی حرص و ہوس...... دو وقت کی روٹی جہاں تہاں سے ملتی ہے، اب فکر ہے تو دو گز زمین کی جہاں آسودہ ہو جاؤں...... بیچارہ نور خان!!''

یہ سب سنکر معروف احمد بولے: ''ہوگئی آپ کی افسانہ نگاری۔ قبلہ آپ قلمکاروں کی یہی بُری عادت ہے کہ ذراسی بات پر جذباتی ہو جاتے ہو۔ بھائی صاحب! میں اس نور محمد کی بات نہیں کر رہا ہوں، نور محمد خان کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔'' ہم نے پوچھا: ''کون نور محمد خان؟ (محمد پر تاکید)'' بولے ...... ''نور محمد خان (انہوں نے بھی محمد پر زور دیا۔) آپ کے دوست محمد اقبال

خان کے والد۔'' ہم نے کہا...... ''اچھا وہ' چلو اللہ مغفرت کرے''۔ معروف احمد نے پوچھا...... ''تو آپ جنازے میں شریک ہو رہے ہیں؟ ہم نے کہا ...... ''بھئی یہ سچ ہے کہ محمد اقبال یونیورسٹی کے زمانے میں ہمارے اچھے دوست تھے مگر وہ مدتِ مدید سے امریکہ میں آباد ہیں۔ تب سے ہمارے درمیان نہ ملاقات ہوئی نہ مراسلت' اب دیکھیں گے تو شاید ہی پہچان پائیں گے' ہمیں تو معاف ہی کیجئے۔''

ہمارا جواب سنکر معروف احمد غصہ ہو گئے۔ بولے...... ''بھائی صاحب! نور محمد خان کوئی عام آدمی نہیں تھے' سابق ڈائریکٹر' ایک لڑکا IAS آفیسر' دو پولیس محکمے میں بڑے عہدوں پر فائز۔ جملہ داماد بڑے بڑے پوسٹوں پر' خویش و اقارب سب صاحبِ رسوخ۔ وزیروں ممتاز تاجروں اور مقتدر شہریوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا'' ...... ہم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے معصومیت سے پوچھا...... ''وہ سب تو ٹھیک ہے' مگر ان سب چیزوں سے کہاں یہ مطلب نکلتا ہے کہ ہم مرحوم کے جنازے میں شریک ہو جائیں؟ اس پر وہ مشتعل ہو گئے کہنے لگے...... ''خدا نے آپ کو عقل دی ہے' شعور بخشا ہے' حالانکہ آپ کی شاعری سے ان دونوں کا وجود مشکوک ہو جاتا ہے۔ آپ نے دنیا دیکھی ہے مگر معاف کیجئے دُنیاداری میں ابھی آپ طفلِ مکتب ہیں۔'' ہم نے پوچھا کیونکر؟ فرمایا...... ''وہ ایسے کہ بقولِ علامہ سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات ہے' فرض کیجئے کل آپ کی کار کو حادثہ پیش آئے' تو موقعۂ واردات سے لے کر پولیس تھانے کے منشی تک اور منشی سے لے کر وکیل اور جج تک

آپ کو کتنے آستانوں پر جبہ سائی کرنا پڑے گی۔ کتنے جاں گسل مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ چھوڑ یئے حادثے کو خدا آپ کو سلامت رکھے فرض کیجئے کل کو کار ہی چوری ہوگئی۔ بیمہ کمپنی FIR کی کاپی مانگے گی جو تھانے دار آپ کو دیگا نہیں، تاوقتیکہ وہ بیک وقت نہایت بیوقوف، ایماندار، فرض شناس اور رباعی گوشاعر نہ ہو اور صاحب، فرض کیجئے کل کو لختِ جگر کے داخلے کا مسئلہ آن کھڑا ہوا۔ ارے چھوڑ یئے فرض کیجئے کل کو آپ خود مریض ہو کر ہسپتال میں داخلے کے لئے پریشان ہونگے، تب؟ بھائی میرے آپ ایسی جھیل میں تیر رہے ہیں جہاں چپے چپے پر مگر مچھ منہ کھولے گھات لگائے بیٹھے ہیں، کس کس سے خود کو بچایئے گا۔ اس لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ ایسے جنازوں میں شریک ہوتے رہیے۔ جان پہچان ہو جائے گی۔ رسوخ بڑھے گا۔"

اس شور پند سے ہم کچھ دیر کے لئے سکتے میں آ گئے۔ ہمیں لگا کہ جن بلاؤں کے تمام ہونے پر صرف مرگِ ناگہانی باقی بچتی ہے، وہ سب ہماری تاک میں بیٹھی ہیں۔ یعنی اس روزگار میں جتنی بھی بلائیں ہیں ان سے ہمیں صرف نور محمد خان کے جنازے میں شریک ہونے پر نجات مل سکتی ہے۔ ہم نے کہا ہیلو! ہیلو! معروف احمد...... معروف احمد نے فون کاٹا تھا۔

☆☆☆

پھر چاہتا ہوں، نامۂ دِلدار کھولنا

راویان خوش گفتار وشریں دہاں قصہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ابتدائی دور میں برائے فروغِ علومِ دین، ادارۂ فلاح مسلمین کو شاہ عالی نسب یعنی حاکم ملک عرب سے مالی تعاون بصورت دینار و درہم وصول ہوتا تھا۔ ایک عالمِ نشاط وطرب، عجب ڈھب سے چارسو برپا تھا چیلے چانٹے، شہدے، بے فکرے، بھانڈ شاعر، گویے، سیاستدان، دانشور غول درغول اُمنڈتے آرہے تھے۔ میدان عالیشان میں شامیانہ مرصع ومزین ہمہ وقت تنا رہتا تھا۔ ہر طرف نوکر، افسر، رشتہ دار، حاشیہ بردار اپنے اپنے امور میں چاق و چوبند، کمر بستہ، مستعد، مہمانانِ ذی وقار کی خدمت میں کار مفوضہ سرانجام دیتے نظر آتے تھے۔ لذیذ پکوانوں سے لبریز دیگیں ٹھنٹھناتی رہتی تھیں یعنی

بابر بہ عیش کوش کہ درہم دوبارہ نیست

ہماری طرف مَثَل مشہور ہے کہ بری نظر سے اونٹ بھی دیگ میں سما جاتا ہے۔ البتہ مَثَل مذکورہ میں یہ وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ اونٹ سے مراد سالم اونٹ ہے یا بالاقساط۔ پس اس عالمِ عیش وفراعت کو نظر لگ گئی۔ کسی حاسدِ کینہ پرور نے ایک مکتوب بصورتِ گمنام بنام حاکمِ عرب لکھ دیا جس میں مذکور تھا کہ

امت مسلمہ کی امانت میں بلاخوفِ خدا خیانت کی جارہی ہے اور یہ کہ جس پٹرول پر عربوں کی معیشت اور عیش و عشرت کا مدار ہے اس کو ٹنوں کی مقدار میں موٹروں میں جھونک کر پھونکا جا رہا ہے۔ یعنی ذمہ داریانِ ادارۂ فلاح مسلمین:

نہ حشر ونشر کے قائل (ہیں) نہ کیش وملت کے

تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔ عرب کے مذہبی اور خزانے کے امور کی وزارتوں نے مکتوب کا سنجیدہ نوٹس لیا اور پروانہ بغرضِ وضاحتِ صورت احوال ادارۂ مذکورہ کو روانہ کیا۔ کہتے ہیں جب ادارے کے سربراہ کو پروانہ ملا تو ان کے ہوش و خرد کے چراغ گل ہو گئے۔ اس پیر فرتوت کو بیم تھا کہ کوئی غنیمِ روسیاہ اس کرتوتِ بد کا ارتکاب کرے گا۔ خوف و ہراس میں اِدھر اُدھر ہرکارے دوڑا دیئے کہ تمام اراکین کو جو جہاں میسر ہو اور جس حالت میں ہو اصالتاً حاضر کرو۔ چاروں طرف اژدحام اور غدر مچ گیا۔ کوئی موٹر سے، کوئی ٹانگے سے، کوئی سائیکل پر تو کوئی پیادہ پا روانہ ہوا۔ عجب ہڑبونگ تھی۔ سب افراد حاضر ہوئے تو سرپرست نے ان پر صورتِ حال منکشف کردی۔ ہر چند کہ مکتوب عربی زبان میں تھا۔ مگر تجربہ کار لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپ چکے تھے۔ بارے مکتوب مولوی محبوب الٰہی کے ہاتھ میں دیکر ارشاد ہوا کہ بہ آوازِ بلند بیان ہو۔ مولوی صاحب نے سینے میں دِل گداختہ پیدا کر کے خط کی قرأت کچھ اس سوز سے فرمائی کہ حاضرین پر رقّت اور سرپرست پر دہشت طاری ہوئی۔ ایک صاحب تو ہر جملے کے بعد ماشاء اللہ، اور الحمد اللہ کہہ کر منہ پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ ایک

اور جناب دوران قرأت ہاتھ باندھے رہے مبادا عرب اور عربی زبان کی شان میں گستاخی نہ ہو۔ مولوی صاحب نے مکتوب پڑھ کر منہ گریبان میں ڈال دیا۔ کچھ ممبران نے بھی اقتداء کی یہ سوچ کر کہ شاید یہ بھی فرض ہے۔ سرپرست نے مضطرب ہو کر پوچھا کہ مولوی صاحب آخر ماجرا کیا ہے؟ مولوی صاحب نے افسوس سے ہاتھ مل کر کہہ دیا کہ ''پانی ناف تک پہنچا ہے''۔ اس پر ایک ممبر نے مولوی صاحب سے پوچھا:

''مولانا! عربی میں ناف کو کیا کہتے ہیں''

☆☆☆

مری ناف ٹل گئی

یہ سُنتے ہی سرپرست غصے سے لال پیلا ہو گئے۔ متکلم سے یوں مخاطب ہوئے: ''بشیر احمد! خدا نے تمہارے ''سرِ پُرفتور'' کو ''مبینہ عقل'' سے خالی رکھا ہے کس واسطے کہ تمہارے دماغ کی جگہ ناف مقرر ہوئی ہے''۔ یہ سُن کر سب اراکین سناٹے میں آ گئے۔ خواجہ عبدالرشید مشکوک کو محسوس ہوا کہ بشیر احمد کا جوابی جملہ مکالمے اور مکالمہ بالترتیب مجادلے اور محاربے کی صورت اختیار کرے گا لہٰذا قیامِ امن کے لئے فوری طور پر امریکہ کی طرح پیش رفت کی۔ سید مقصود علی خادمؔ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''سید صاحب! ناف کے موضوع پر ایک زبردست شعر فی البدیہہ موزون ہُوا ہے''۔ خواجہ صاحب نے خوب اچھی طرح گلا کھنکھارنے کے بعد شعر کو اپنے ترنم کے کند خراد پر یوں چڑھایا کہ نرخرے میں درماندہ بلغم کے سبب لفظوں سے سینے کے درد اور انفکشن کا خروج ہُوا:

اُس نازنیں کو یونہی اُٹھایا تھا اک ذرا
انگڑائی اُس نے لی تو مری ناف ٹل گئی

سید مقصود علی نے اپنی نشست سے اُچھل کر داد دی: ''واہ! واہ! خواجہ

صاحب! نازک خیالی اور رعایتِ لفظی کے ساتھ ساتھ معاملہ بندی غضب کی ہے۔ واللہ خواجہ صاحب! جو آپ لکھنو کے باشندے ہوتے تو حضرتِ ناسخؔ، حضرت آتشؔ، حضرتِ جرأت...... یہ سب آپ کو دیکھ کر دُم کے بجائے دیوان دبا کے بھاگ کھڑے ہو جاتے۔" خواجہ صاحب انکسار کے ساتھ کرسی سے اُٹھے اور جھک کر فرمایا: "آداب عرض ہے، ذرہ نوازی کے لئے ممنون ہُوں۔ آپ بھی سید صاحب! سخن شناسی میں کسی خان آرزوؔ سے کم نہیں۔"

سرپرست بھری بندوق کی طرح بیٹھے یہ سب سُن رہے تھے۔ نہایت کرخت لہجے میں بولے: "یہ آپ لوگ آفیشل میٹنگ میں کیا اناپ شناپ بک رہے ہیں۔ سید صاحب! رعایت لفظی، معاملہ بندی...... یہ سب کیا ہے؟ ایسے شاعر کی تو بنا کسی رعایت کے نس بندی کرنی چاہیے۔ اور ہاں مشکوکؔ صاحب قبلہ! یہ شعر آپ پچیس برس قبل عرض چکے ہیں۔ تب مصرعۂ اولیٰ یوں تھا:

اس نازنیں کو کل جو اُٹھا یا پلنگ سے

لیکن چونکہ اس دوران آپ دو دفعہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے ہیں لہٰذا آپ کے شعر اور کردار میں اتنی ترمیم غنیمت ہے...... دیکھئے حضرات! ہم یہاں اس بات پر صلاح و مشورہ کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کہ آئی بلا کیسے ٹل سکتی ہے۔ تعجب ہے آپ ناف ٹلنے کا مقدمہ لے کر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب! آخر خط میں مکتوب الیہ سے کس چیز کا تقاضا کیا گیا ہے، ذرا تفصیل اجمال کے ساتھ بیان فرمائیں اور ہاں ریختہ سے حتی الامکان پرہیز کریں"۔

مولوی محبوب الٰہی نے فرمایا کہ کسی دجال، زندیق، ملحد، ڈھو کے باز، بے

دین اور بدعقیدت انسان نے عرب سرکار کو ایک شکایتی مکتوب کے ذریعہ یہ اطلاع فراہم کی ہے کہ ادارۂ ہذا کے منتظمین عرب سے حاصل شدہ امدادی رقومات کو بطریقِ مکر وفریب اشغالِ لہو ولعب میں صرف کرر ہے ہیں الہذا عرب سرکار نے مشاہدین کا ایک وفد تشکیل دیا ہے جس کے ارکان بچشمِ خود حقائق کا سراغ لگا کر حسبِ حالات رپورٹ پیش کریں گے۔

یہ خبر پاتے ہی مشتاق احمد کلووال نے جو چپراسیوں کی سہ رکنی انجمن کا خود ساختہ و پرداختہ صدر تھا ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ اس نے برسرِ اجلاس اپنی ٹوپی سر سے اتار کے گھٹنے کو پہنا دی اور بیڑی کا زوردار کش لگا کر کھانستے کھانستے کہا :''ساتھیو! یہ ہماری حق تلفی اور بد دعاؤں کا اثر ہے۔ جانباز، جرار، مشکی گھوڑوں پر سوار، یلغار کے لئے تیار، ہاتھوں میں ننگی تلوار، سر پہ عمامہ منہہ پر شملہ، لشکر سالار کے اشارے کے منتظر ہیں۔ ایک بار نعرۂ جہاد بلند ہوا اور اللہ اکبر کی فلک شگاف للکار گونجی۔ دیکھنا امریکہ کو مسخر اور اسرائیل کو اپنے برق رفتار گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روند کر، وہ یلغار کریں گے کہ جہاں آج نغمہ ہائے عیش وعشرت گونجتے ہیں وہاں کل اینٹ سے اینٹ بجے گی، ہر گوشۂ ایمن سے صدائے آہ وفغاں آئے گی''۔ مشتاق احمد نے نسیم حجازی کے اسلوب دلپذیر میں وہ تقریر کی کہ دو نفوس پر مشتمل مجمعے پر لرزہ طاری ہو گیا۔ محمد امین چپراسی نے سراسیمہ ہو کر پوچھا ''غبن تو یہاں ہو رہا ہے' غدر امریکہ اور اسرائیل پر کیوں ہو گا؟''

☆☆☆

مکھی

ہمیں مکھیوں اور متشاعروں سے سخت کوفت ہوتی ہے۔ دونوں کی نشو ونما کا دار و مدار گندگی، غلاظت اور عفونت پر ہوتا ہے۔ یعنی جس سماج میں جس قدر ذہن گندے اور غلیظ ہوں گے وہاں اسی قدر متشاعر پیدا ہوں گے۔ جس قدر ماحول پراگندہ ہوگا اسی قدر مکھیاں موجود ہوں گیں۔ نوع انسانی کو ہر دو کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ہم تجویز پیش کرتے ہیں کہ عالمی سطح پر ایک ایسی غیر سرکاری تنظیم تشکیل دی جائے جسے یو این او کا تعاون فراہم ہو۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مجوزہ تنظیم کی کانفرنسوں میں ہماری ادبی انجمنوں کے زعماء اور میونسپلٹی کے اراکین کو یکجا بیٹھ کر اپنے خیالات شیئر کرنے کا موقع فراہم ہوگا۔ دیکھا جائے تو متشاعروں کے مقابلے میں مکھیاں معصوم اور قابل برداشت ہوتی ہیں۔ ہمارے دوست ڈاکٹر نذیر آزاد کے دل میں مکھی کے لیے کافی احترام موجود ہے۔ جس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں مکھی انسان سے کم ضرر رساں ہے۔ ہم نے ایک دن کہا: مکھیاں گندگی اور غلاظت منتقل کرتی ہیں۔ جواب میں فرمایا: وہ انسان کی گندگی کو غیر ارادی طور پر منتقل کرتی ہیں اور جس جرم میں مجرم کا ارادہ شامل نہ ہو وہ قابل دست درازئ پولیس تو ہو سکتا ہے قابل

دست اندازیٔ پولیس ہر گز نہیں۔ ہمیں موصوف کی رفاقت کا شرف کئی برس تک رہا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہم کمرے میں مکھیاں دیکھ کر حواس باختہ ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ کھڑکیاں کھول کر مکھیوں کو ہمارے خلاف اور ہمیں مکھیوں کے خلاف برسر پیکار رکھتے۔ نتیجہ یہ کہ ہم جتنی دیر لوکل نیوز پیپر ہاتھ میں اٹھا کر مکھیوں کا تعاقب کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچاتے، اتنی دیر موصوف گہری نیند سو جاتے۔ حالانکہ کئی دفعہ ہمیں مکھی کو ان کے چہرے پر موت کے گھاٹ اتارنا پڑا، ان کی نیند میں ہماری خونریزی کبھی مخل نہ ہوئی۔
ہم نے بچپن میں ایک کہانی سنی تھی۔ کہتے ہیں ایک دفعہ کسی امیدوار کو امتحان میں ۱۰۰ نمبرات میں سے صرف ۱۰ نمبر حاصل ہوئے۔ چنانچہ تقدیر کا کھیل دیکھئے ایک مکھی ازغیب نمودار ہوئی اور اپنے پنکھ روشنائی کی بوتل میں بھگو کر ٹھیک ۱۰ کے بغل میں بیٹھ گئی اور صفر بنا دیا۔ اس طرح سے امیدوار نے ۱۰۰ میں سے ۱۰۰ نمبرات لے کر پہلی پوزیشن حاصل کی:

ہمیں اب تک سمجھ میں نہ آیا کہ مکھی کی غلاظت سے تقدیر کی کرامت کیسے ثابت ہوتی ہے۔ آج کل نا قابل امیدواروں کے نمبرات بڑھانے کے لیے مکھی کو روشنائی سے استنجا کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ یہ فریضہ ہمارے کچھ نام نہاد قوم اور نسل پرست ممتحن خود انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے دوست ڈاکٹر گلزار احمد پڈر کا خیال ہے کہ ایسے حالات میں قوم کی فلاح کے پیش نظر ایسے امیدوار اور ممتحن دونوں کو گولی سے ڈھیر کر دینا چاہیے۔ حفظ ما تقدم کے طور پر مکھی سے بھی ایسا ہی سلوک روا رکھنا چاہیے کیونکہ ایسا ناہنجار اور

نابکار امیدوار اگر پاس ہوتا رہا تو پی ایچ ڈی کر کے یونیورسٹی یا کالج کا پروفیسر بن جائے گا اور اگر یہ سعادت نصیب نہ ہوئی تو کوئی سیاسی پارٹی جوائن کرے گا۔ دونوں صورتوں میں اس کا وجود خطرناک ہے۔ مکھی سے بھی زیادہ خطرناک۔ ایک دفعہ ہم نے مولوی صغیر احمد سے پوچھا: مولانا! فرض کیجیے کہ ہم دودھ پی رہے ہیں اور دودھ میں مکھی چلی گئی۔ اس صورت میں کیا دودھ پینے میں کوئی کراہت ہے۔ فرمایا چونکہ اطباء کی متفقہ رائے ہے کہ آئی بی ایس کے مریض کو دودھ سے پرہیز کرنا چاہیے گویا دودھ پی کر آپ نے خود کو ضرر پہنچانے کی شعوری کوشش کی ہے جو بذات خود ایک مکروہ عمل ہے جس کے لیے آپ کو کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔

دوسرا یہ کہ آپ کی غفلت سے مکھی کی جان گئی جو بذات خود خفیف سہی مگر گناہ ہے، جس کے لیے آپ کو کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ تیسرا یہ کہ چونکہ آپ کی طبیعت نازک ہے اور آپ نے دودھ پھینکا ہوگا جس سے توہین نعمت ثابت ہوتی ہے جس کے لیے آپ کو کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ چوتھا یہ کہ ہم نے مولانا کو روکتے ہوئے عرض کیا: چوتھا یہ کہ ہماری شامت آگئی تھی جو آپ سے پوچھ لیا جس کے لیے ہمیں ضرور کفارہ ادا کرنا ہوگا۔

☆☆☆

اردو کی بالکل نئی کتاب

(تنبیہ: یہ نصاب صرف ریاست جموں وکشمیر کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔اس کے جملہ حقوق مصنف کے پاس بالکل محفوظ نہیں نیز مصنف کا اپنے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

پہلا سبق: بجلی

پیارے بچو! کہتے ہیں بجلی ایک انگریزی سائنس دان نے پتنگ بازی کے دوران دریافت کی۔ کاش اس سائنس دان کو کبوتر بازی کا بھی شوق ہوتا۔ بجلی کو انگریزی زبان میں پاور بھی کہتے ہیں مگر کچھ لاحقے اور سابقے اس کی معنویت یکسر بدل دیتے ہیں جیسے مین پاور، پاور کرائیس، پاور بریک ڈاؤن وغیرہ، پاور کے ایک معنی اقتدار کے بھی ہیں جس سے ڈرنا چاہیے۔ بجلی کی پیداوار ہوتی ہے جیسے دھان، مکئی، جو، گیہوں، شکر، دالوں، دلالوں اور دانشوروں کی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی تجارت ہوتی ہے مگر تاجروں سے زیادہ دلال فائدے میں رہتے ہیں۔ بجلی کوئی عوامی ملکیت نہیں، جس کے لیے ہرایرا غیرانتھو خیرا مطالبہ کرتا پھرے۔ یہ ایک قومی امانت ہوتی ہے اور اس کے صحیح امانتدار قوم کے غمخوار ہی ہوتے ہیں۔ بعض تشدد پسند افراد بجلی کی عدم فراہمی کے خلاف سڑکوں پر آکر کھلم کھلا احتجاج کرتے ہیں۔ یہ ایک غیر جمہوری طرزِ عمل ہے۔ اس سے احتراز کرنا چاہیے اور عوام کو یہ امر ذہن نشین کرنا چاہیے کہ ہمارے یہاں چناؤ کا عمل ہی جمہوری عمل کہلاتا ہے۔ اور پھر امن وقانون شہر سرینگر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے والے چوپائے نہیں جنہیں میونسپل

کارپوریشن نے کھلی چھوٹ دی ہے۔ نظم وضبط بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ چنانچہ شر پسند عناصر کے خلاف چُست، جوشیلے، پھرتیلے، البیلے، چاک و چوبند، مستعد اور کیا کہتے ہیں جموں کشمیر پولیس کے جانباز سپاہی نرالے کاروائی عمل میں لاتے ہیں۔ دوسرے دن اخباروں میں مضروبین کی پھوٹی ہوئی کھوپڑیوں کی سوجھی ہوئی تصویریں ع

دیکھو انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

کے عنوان سے چھپتی ہیں۔ کچھ احتجاجیوں کو حفظِ ماتقدم کے طور پر حراست میں لیا جاتا ہے۔ ایسا کرنا ضروری ہے اور اس کے تین اہم فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ قومی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ دوسرا یہ کہ حزب اختلاف کو بیان دینے کا نادر موقع ملتا ہے، تیسرا فائدہ ہم اس وقت بھول گئے۔ دراصل عوام اپنے بزرگوں کی صحت مند روایات کو فراموش کر رہے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کے عہد میں بجلی نہیں تھی، اس کے باوجود انہوں نے خوشحال زندگی بسر کی۔ نہ بجلی فیس کا سر درد، نہ کٹوتی کا ٹینشن، نہ تار اور لیمپوں کی فضول خرچی، نہ لائن مین کا تقاضا اور نہ کوئی احتجاج۔ کتنے امن پسند تھے ہمارے بزرگ۔ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔ ہمیں یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بجلی ایک خطرناک چیز ہے۔ اگر کوئی شخص بجلی کے تار کو چھوتا ہے تو اُسے کرنٹ لگتا ہے، بعد ازاں وہ فوت ہو جاتا ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس اگر کسی شخص کو بجلی کا تار چھوتا ہے تو یہی عمل اسی ترتیب کے ساتھ واقع ہو جاتا ہے۔ لہذا قیمتی جانوں کے زیاں کو روکنے کے واسطے بجلی سے پرہیز کرنا نہایت ضروری

ہے۔آئے دن بجلی کی چوری کے دوران دلدوز حادثے پیش آتے ہیں۔ دریں حالات سوگوار علاقے میں صفِ ماتم بچھ جانے سے پہلے بجلی محکمے کے افسران اس بات پر سراسیمہ ہوجاتے ہیں کہ اس علاقے میں بجلی آئی کہاں سے؟ ایسی وارداتوں کے سدِ باب کی غرض سے حکام نے صارفین کے گھروں میں ہی میٹر لگانے کا انقلابی قدم اٹھایا ہے۔اب نہ ٹک لگانے کا بکھیڑا ہے اور نہ چھاپے کا اندیشہ۔جدید طرز کے میٹروں پر پیس بریکر نصب کرنے کی صلاحیت اور اہلیت رکھنے والے اہلکار سستے میں دستیاب ہیں۔بس صارف کی جیب بھری اور اہلکار کی نیت صاف ہونی چاہیے۔سنا ہے ہماری سیاسی پارٹیوں کے زعماء نے اگلے چناؤ نشان کے طور پر موم بتی، چراغ، ٹارچ، ماچس، چاند، ستارے اور اس قبیل کی چیزوں کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔کیونکہ ہمارے سیاسی رہنما جانتے ہیں کہ جب تک بانس کے جنگل اُگیں گے، بانسری بجتی رہے گی۔

☆☆☆

دوسرا سبق: پانی

پیارے بچو! آج تک کسی سائنسدان نے پانی ایجاد یا دریافت کرنے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ لہٰذا اباور یہی ہوتا ہے کہ یہ کارِ خیر مستقبل کے کسی سائنس دان کے ہاتھوں انجام پائے گا۔ البتہ سائنس دانوں نے پانی کے اجزائے ترکیبی کا سراغ لگایا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں بھی کرتے تب بھی پانی، پانی پانی ہی ہوتا۔ پانی کا رنگ پانی کے جیسا ہی ہوتا ہے اور ذائقہ بھی۔ پانی خون کے مقابلے میں پتلا ہوتا ہے اسی لیے پانی ہی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ بھارت کے ایک مشہور شہر پانی پت کا پانی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ شہر پانی کے لیے نہیں، ان خونریز جنگوں کے لیے مشہور ہے جن میں انسانی خون پانی کی طرح بہایا گیا۔ ہمارے یہاں پانی کی عدم فراہمی کے خلاف عوام سڑکوں پر آ کر خالی برتنوں کو ٹھنٹھنا کر احتجاج کرتے ہیں جس پر پولیس والوں کا ماتھا ٹھنکنے لگتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی پت کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ شاعرِ مشرق نے بھارت کی ایک مشہور ندی گنگا سے فارسی آمیز اُردو میں ماضی کے کچھ گمشدہ کاروانوں کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ کہتے ہیں موصوف کا

تفتیشی لہجہ گنگا پر گراں گزرا اور وہ اسی رنج میں گلنے لگی۔ علامہ مرحوم کے کچھ طرفدار البتہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ موصوفہ کی یہ دُردشا پاپیوں کے پاپ دھوتے دھوتے ہوگئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ پانی سب کے لیے ضروری ہے البتہ مسلمان قوم پانی کے بغیر بھی گزارہ کرسکتی ہے کیونکہ مسلمانوں کے لیے غسل، وضو وغیرہ کے وقت تیمم کی گنجائش موجود ہے۔ حتیٰ کہ پینے کے لیے بھی یہ قوم پانی کی منت کش نہیں۔ جدھر پیاس لگی اُدھر تیمم کیا۔ مسلمان اپنی ہر ضرورت تیل سے پورا کرسکتے ہیں۔ ان کے پاس ایک قلندر ایسا ضرور ہوتا ہے جو کسی کو بھی اپنی بات سے پانی پانی کرسکتا ہے۔ عزیزو! ہندوستانی موسیقی کی سرگم کے دو اہم سروں پا اور نی کا بھی پانی سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا جب کوئی گویا پکا راگ گاتے وقت پانی پانی کی تکرار کرتا ہے تو اُسے ہرگز پانی نہیں پلانا چاہیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے سامعین پانی بھی نہیں مانگتے، نجات مانگتے ہیں۔

دنیا میں کئی اقسام کا پانی موجود ہے۔ روایت کی رُو سے ایک قسم کا پانی وہ ہے جسے پینے والا تا قیامت جوان اور تندرست رہتا ہے۔ اسی لیے حضرت خضر نے آج تک یہ پانی کسی کو پینے نہ دیا، سکندر کو بھی نہیں۔ جناب خضر ابھی ولر کے کنارے پر بیٹھ کر ہمالہ کے ان چشموں کے اُبلنے کی معیاد مقرر کرنے پر غور و خوض کر رہے ہیں جو کب کے سوکھ بھی چکے ہیں۔ تعجب ہے موصوف اور سرکار دونوں کو ولر کے سوکھنے کی بھی خبر نہیں۔ مراقبے میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ اسی قبیل کا ایک چشمہ دشتِ سیاست میں بھی ملتا ہے مگر اس کے پانی کے اثر کی معیاد چھ

سال ہے۔ پس جس نے یہ پانی پیا اُسے چھ سال تک ڈاکٹروں کے کلینکوں اور بیوٹی پارلروں پر نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اور بیوٹی پارلر والے اپنی خدمت انجام دینے کے لیے صاحب کی کوٹھی پر اصالتاً حاضر ہو جاتے ہیں۔ کالا پانی بھی ایک پانی ہے، جہاں بھارت کے خطرناک عمر قیدیوں کو بھیجا جاتا ہے۔ کالا پانی کی طرز پر ہمارے سرکاری محکموں میں ایک ایسی سیل موجود ہوتی ہے جہاں بے قابو ایمانداروں اور شوریدہ سر بدعنوانوں کو اٹیچ کیا جاتا ہے۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو رنگون بھیج کر بے وقوفی کی۔ اگر کسی دفتر کی کسی گمنام سیل کے ساتھ اٹیچ کیا ہوتا تو وہ غیرت کی وجہ سے فوراً فوت ہو جاتا۔

☆☆☆

تیسرا سبق: زمین

عزیزو! زمین اُس خاکی کو کرہ کو کہتے ہیں جس پر چرند، پرند، درند اور انسان رہتے ہیں۔ یہ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جس پر عام انسان فتنہ و فساد کرتے رہتے ہیں، دوسری وہ جس پر ہمارے شعراء حضرات ایک دوسرے کے خلاف بارودی سرنگیں بچھاتے پھرتے ہیں۔ زمین تقسیم کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس کا بندر بانٹ بھی ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں بندروں نے ایسا کیا تھا۔ تب سے لے کر اب تک فریقین گز لے کر ایک دوسرے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ زمین آسمان سے اور آسمان زمین سے بہت دور ہے۔ اتنی مسافت کے باوجود چناؤ کے دوران ان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ زمین کی اپنی سطح ہوتی ہے جسے زمینی سطح کہا جاتا ہے۔ عام طور پر اہل اقتدار کو زمینی سطح کی صورتحال میں زمین تو نظر آتی ہے مگر اس پر رینگتے ہوئے بے کسوں کی دُردشا نظر نہیں آتی۔ زمین انسانوں کو طرح طرح کی غذائیں فراہم کرتی ہے جنہیں وہ مزہ لے کر کھاتا ہے۔ مگر زمین کی ایک ہی غذا ہے: انسان۔ کسی شاعر نے زمین اور آسمان کے مابین تفرقہ ڈالنے کی غرض سے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ زمین آسمانوں کو کھا جاتی ہے۔ کہاں زمین اور کہاں آسمان۔ اسی طرح سے

جب بازار سے ضروری اشیاء راشن گھاٹ سے چاول، آٹا، کھانڈ، مٹی کا تیل، ڈیلروں کے اسٹور سے گیس، سرکاری دفتروں سے بابو، عام شہری کے گھر سے بجلی، پانی اور امن وسکوں اور بدنصیب والدین کے پہلو سے جوان گبرو بیٹا غائب ہو جاتا ہے تو زمین اور آسمان کی طرف مشکوک نظریں اٹھتی ہیں۔ زمین اور آسمان کے بارے میں ایسی بدگمانی پھیلانا ٹھیک نہیں۔

زمین میں صرف مردے ہی نہیں گاڑے جاتے بلکہ بڑے بڑے سکینڈلوں کی تحقیقی رپورٹیں اور تفتیشی کاروائیوں کی روداد بھی بنا کسی تجہیز و تکفین کے اس طور سے زمین میں دفن کی جاتی ہے کہ نشان بھی نہیں رہتا۔ میرؔ کا شعر ہے ؎

مت تربتِ میرؔ کو مٹاؤ
رہنے دو غریب کا نشان تو

البتہ ہرنئی سرکار کے کارندے گڑی فائیلوں کو اُکھاڑنے کی دھمکی اور یقین دہانی کرتے ہیں مگر جب ہر شکل کے پیچھے اپنی تصویر نظر آتی ہے تو کسی قلندر کے آستانے پر دھمال ڈالتے ہیں۔

اگلے زمانوں میں اہلِ اقتدار جن عناصر سے بدظن ہو جاتے تھے اُنہیں چُن چُن کر یا تو فصیلوں سے گروایا جاتا تھا یا پھر کسی خطرناک مہم پر بھیجا جاتا۔ البتہ بزرگوں کو حج بیت اللہ پر روانہ کیا جاتا تھا۔ اب ملک کے مرکزی تفتیشی اداروں اور نجی ٹیلی ویژن چینلوں کے خوف سے یہ کاروائیاں دوسرے انداز سے سرانجام دی جاتی ہیں۔ یہ مقصد اہل کشمیر حریفوں کی مٹی

میں نمک دے کر حاصل کرتے ہیں۔نمک خوار مٹی حق نمک ادا کرتی ہے۔ایسی بنجر زمین پر سالہا سال تک کوئی بیج سر نہیں اٹھاتا۔مٹی سے تیل بھی نکلتا ہے، جیسے بادام، اخروٹ وغیرہ اور مزدور کے خاکی جسم سے نکلتا ہے۔اسے مٹی کا تیل کہتے ہیں اور اس تیل سے غریب غرباء کے گھروں میں چراغ اور چولہے جلتے ہیں۔جب غریب آدمی حالات زندگی سے تنگ آتا ہے اپنے جسم پر یہی تیل چھڑک کر باقی کا کام کرتا ہے۔مٹی کے تیل نے بعض خوش بختوں کو اس قدر آسودہ بنادیا ہے کہ وہ زمین سے تیلِ خاکی نکالنے کے پلانٹ لگا سکتے ہیں۔

☆☆☆

چوتھا سبق: گیس

عزیزو!

''اُردو کی آخری کتاب''میں مادہ کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ غالباً اُس زمانے میں مادہ کی اتنی ہی قسمیں رہی ہونگیں۔ ہمارے دور میں مادہ کی کل کتنی قسمیں ہیں یہ مادہ پرست اور مادیت پرست زیادہ وثوق سے بتا سکتے ہیں۔ عام لوگوں کے لئے اب بھی مادہ کی تین قسمیں فرض کی جاتی ہیں۔ ٹھوس، مائع اور گیس، ان میں گیس سب سے اہم اس لئے ہے کہ فی زمانہ یہی وہ ٹھوس چیز ہے جس سے سرمایہ حاصل کیا جاتا ہے۔ گیس اپنی ترقی یافتہ شکل میں مایہ کی شکل اختیار کرتی ہے۔ گیس کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کی تلاش میں عام صارف تڑکے نہار منہ نکلتا ہے اور دن بھر قطاروں میں دھکے کھا کھا کر شام کو بے نیل ومرام لوٹتا ہے۔ اس طرح کے مسلسل فاقوں اور گھر والی کی چیخ چیخ سے وہ کچھ دنوں کے بعد خود گیس کی شکایت کرنے لگتا ہے۔ گیس کی دوسری قسم یہی ہے جو بالآخر غریب صارف کو مریضوں کی قطار میں کھڑا کر دیتی ہے۔ سرکار نے گیس کی تقسیم کاری میں شفافیت اور معقولیت پیدا کرنے کیلئے جو حالیہ اقدامات اٹھائے ہیں، عوام خوامخواہ ان پر احتجاج کر رہے ہیں۔ سرکار کی

اپنی پالیسی ہوتی ہے جو افسر شاہوں کے زرخیز ذہنوں سے برآمد کی جاتی ہے۔ سرکار کی پالیسی عوام کی سمجھ سے اسی طرح برتر اور بالاتر ہوتی ہے جس طرح عوام کی ضروریات زندگی سرکار کی سمجھ سے باہر ہوتی ہے۔ سرکار کی حالیہ پالیسی میں کئی عوامی فوائد مضمر ہیں۔ مثلاً ایک گیس کھلے عام بلیک میں نہیں بیچی جائیگی۔ عزیزو! ہمیں ایسے کام کھلے عام نہیں کرنے چاہئے۔ اس سے سرکار کی کارکردگی پر اخبار اور ٹی وی والے سو طرح کے اندیشے ظاہر کرتے ہیں۔ نتیجتاً عوامی حلقوں میں سرکار کے تئیں بدگمانی پھیل جاتی ہے اور غریب آدمی کے ذہن میں انقلاب کے بھیانک خیالات آجاتے ہیں۔ موجودہ پالیسی کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ عوام گیس کے مقابلے میں انرجی کے روایتی طریقوں کی طرف رجوع کریں گے۔ چولھے جلائیں گے۔ پیڑ اُگائیں گے، جن پر آنے والی نسل کے چھیل چھبیلے جھولے ڈالیں گے۔ اس سے ماحولیات، لوک ادب اور کوک شاستر پر اچھے اثرات مرتب ہونگے۔ ہمارے ملک کی اقتصادیات تب تب ڈانوں ڈول ہوجاتی ہے جب جب غریب غرباء خط افلاس سے یہ دیکھنے کیلئے سر اُٹھاتے ہیں کہ امیر امراء کہاں پہنچ گے۔ اگلے زمانوں میں اس صورتحال کو قابو میں لانے کیلئے غیر انسانی ہتھ کنڈوں سے ان کی (یعنی غریبوں کی) کھال اتاری جاتی تھی۔ اس مذہب مہذب دور میں انہیں اپنی مقررہ حد میں رکھنے کے لئے بحران پیدا کئے جاتے ہیں۔ اس سے اقتصادی حالت متوازن ہوجاتی ہے۔ عوام کو ڈسپلن کا پابند بنانے کے لئے انہیں ہمیشہ کسی نہ کسی کنوئیں میں رکھنا ضروری ہے، نیز سحر خیزی کا رجحان بھی اب ختم ہورہا ہے۔ حافظ شیرازی

نے اپنے ایک فارسی شعر میں کہا ہے:

کہ دعائے سحر گاہی اثرے کند شمارا

پیارے بچو! گیس کے بڑے خطرات ہیں، کبھی کبھی یہ لیک بھی ہو جاتی ہے۔ اس سے بدبو پھیل جاتی ہے۔ اس صورت میں فوراً کھڑکیاں اور دروازے کھول دینے چاہیئے۔ بعض لوگ سلینڈر کی نشاندہی میں وقت ضائع کرتے ہیں، اس سے ماحول بگڑ جاتا ہے اور خوامخواہ آپس میں رنجش پھیل جاتی ہے۔ حفاظتی تدبیر کے طور پر اپنے منہ پر رومال رکھنا چاہیئے۔ البتہ کسی سکینڈل کے لیک ہونے کی صورت میں اپنے بجائے دوسروں کے منہ پر رومال رکھنا روا ہے۔ وکی لیکس کی طرح۔ حکیم ابن انشا نے گیس کی شکایت دور کرنے کے لئے جو نسخہ تجویز کیا ہے، اس کے استعمال کی ترکیب الٹی ہے اسی لئے گیس کی پرابلم نے وبائی صورت اختیار کی ہے۔ گھر کے مرد کو چاہیئے کہ وہ حکیم صاحب مرحوم کا نسخہ اپنے بجائے گھر والی پر آزمائے۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔

☆☆☆

پانچواں سبق: شاعر

عزیزو! قوم خود ہو نہ ہو شاعر کا ہونا ضروری ہے۔ جس طرح شیر کے بغیر جنگل اُدھورا سا لگتا ہے اُسی طرح شاعر کے بغیر قوم سُونی سُونی سی نظر آتی ہے۔ لہذا ہمیں اپنے شاعروں اور شیروں دونوں کی حفاظت اور قدر کرنی چاہئے۔ ایک زمانہ تھا جب ہماری قوم اپنے شاعروں کے پیچھے پیچھے چلتی تھی۔ بُرا ہو رفتارِ زمانہ کا جو ہماری اجازت کے بغیر تیز ہو گئی اور اتاولی قوم شاعروں سے کہیں آگے نکل گئی۔ سمے کے اس چکر میں دیکھیں تو شاعر اور قوم ایک ہی محور پر ایک دوسرے کے پیچھے ہی چل رہے ہیں۔ دونوں پسماندہ اور پیش پا افتادہ۔ عزیزو! زمانہ بدل گیا ہے، اب وہ وقت نہیں کہ شاعر اکتارہ ہاتھوں میں لیکر گلے میں جھولا ڈالے۔

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا

گاتے ہوئے گلی گلی پھرتا چلے اور لوگوں سے داد وصول کرے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ داد سے کسی کا پیٹ بھر سکتا ہے اور نہ نیت سے۔ بالفرض اگر کوئی شاعر گھر کا راستہ بھول بھی جائے تو نگری نگری پھرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی کیونکہ اگلے روز اخباروں میں اُس کی پُر اسرار گمشدگی کے بارے میں اشتہار چھپیں گے۔ ممکن ہے لواحقین یہ پخ بھی نکالیں کہ موصوف کا دماغی توازن خراب ہے۔ اس صورت میں تو ویسے بھی شریف آدمی خودکشی کو اپنی بازیابی پر ترجیح دے گا۔ اسد اللہ خان غالبؔ نے بھی شیراز، مصر اور نجف وغیرہ کی سیاحت کی تجویز رکھی تھی۔ دبیر الملک نے اس تجویز

پر عمل درآمد کیوں نہ کیا اسکی کئی وجہیں بتائی جاتی ہیں۔ موصوف کا اقبالیہ بیان ہے کہ قویٰ مضمحل ہونے کی وجہ سے سفر کی صعوبتوں سے پرہیز کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عناصر کی بے اعتدالی حارجِ سفر بنی۔ البتہ مورخین لکھتے ہیں کہ سلطنت کے تنزل کے بعد مدح خوانِ تاجدار پر عسرت کی وجہ سے وہ بجوگ پڑا تھا کہ اسبابِ سفر کے طور پر شطرنجی، ٹین کے لوٹے اور سُوت کی رسی کا بندوبست نہ کر سکا۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

ہمارے شعراء ایسی نحوست سے پاک ہیں کیونکہ ماشاءاللہ اُن کے ممدوح عمر، دولت، اقبال اور اقتدار میں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ مرزا نے تو نصیرالدین حیدر اور امجد علی شاہ کو ایک ایک قصیدے میں نپٹا دیا۔ پتہ نہیں واجد علی شاہ کس طرح تین قصیدوں کے متحمل ہوئے۔

عزیزو! ہمارے یہاں شاعروں کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔ ایک افسر شاعر دوسرا غیر افسر شاعر۔ افسر شاعر وہ ہوتا ہے جسے ثقافتی ادارے سر پر، نقاد پلکوں پر اور گویے طبلے پر بٹھاتے ہیں۔ اسی لئے مغل خاندان کے آخری چشم و چراغ نے تمنا کی تھی ؎

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

رہی بات دوسری تمنا کی تو موصوف امور سلطنت کو چھوڑ کر دوسرے امور میں خاصا دور اندیش واقع ہوا تھا۔ جانتا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب گدا شاہوں سے زیادہ آسودہ حال ہونگے۔

☆☆☆



شفق کی یہ تحریریں محض ہنسنے ہنسانے کی چیزیں نہیں ہیں اور نہ ہی شفق کا مقصد قارئین کے لیے ہنسنے ہنسانے یا طعن و تشنیع کے سامان فراہم کرنا ہے۔ بلکہ شفق سوپوری نے اپنے سامنے اور آس پاس کی زندگی سے بعض واقعات اور کرداروں کو چن کر روزمرہ کے سماجی، سیاسی اور ثقافتی نشیب و فراز کو اپنی تحریروں میں مختلف زاویوں سے آئینہ دکھایا ہے۔ کسی فلسفی یا مفکر، مصلح یا سیاسی رہنما کی طرح نہیں بلکہ بھیڑ میں شامل ایک عام آدمی کی طرح۔ شفق کی ان تحریروں کا انفراد اور اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں صدیوں میں محیط اُس اقداری نظام کی بازیافت کی کوشش کی ہے، جو اقداری نظام ہمارے ماحول اور معاشرے کی ہمہ جہت طمانیت کا ضامن تھا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شفق سوپوری نے ان تحریروں کی تخلیق کسی فلسفہ یا نظریہ کی تبلیغ یا پراپیگنڈے کے لیے نہیں کی ہے اس لیے ان تحریروں کا لب و لہجہ شگفتہ ہے جو اپنی لسانی ساخت کی بنا پر ایک طرف جہاں قاری کے اعصاب کو گدگداتا ہے وہیں دوسری جانب ان تحریروں کی زیریں لہریں قاری کو اپنی معتبر اور محترم قدروں کی بازیافت کی راہ پر گامزن ہونے کی ترغیب بھی دیتی ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ شفق سوپوری ایک معتبر شاعر تو ہیں ہی، لیکن ان کے تخلیقی اور تنقیدی کارنامے بھی کم عیار نہیں ہیں اور اب جو ان کی شگفتہ تحریروں کا یہ مجموعہ منظر عام پر آرہا ہے تو اسے شگفتانے بھی کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

پروفیسر قدوس جاوید

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-86486-22-6